ترک ہندستانیم من ہندوی گویم چو آب
(خسرو)

امیر خسرو
بحیثیت
ہندی شاعر

نظریۂ محمود شیرانی کے تنقیدی مطالعے کیساتھ

صفدر آہ



PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

مطبوعہ یونیورسل پریس بمبئی ۲

ناشر

علوی بک ڈپو محمد علی روڈ بمبئی ۳

فہرست مضامین

مقدمہ

امیر خسرو کی ذات ہندوستان کے لئے قابلِ فخر ہے۔ پچھلے ایک ہزار سال میں ایسا جوہر قابل [illegible] ہمارے ملک میں نہیں پیدا ہوا۔ اُن کی[1] ہندی شاعری ہمارے قومی ادب کا سرچشمہ ہے۔ وہ ہندوستانی[2] موسیقی کے مجدد اور آخری نائیک[4] تھے۔ وہ فارسی[3] کے تنہا ہندوستانی شاعر ہیں جن کی زبان خود اہلِ ایران کی نظر میں سعدی و حافظ کی ہم مرتبہ ہے۔ ان کی ہمہ[5] رنگ اور ہمہ گیر شخصیت قوسِ قزح سے بھی زیادہ حسین ہے۔ وہ بحیثیت[6] صاحبِ روحانیت صوفیائے کرام کی صفِ اوّل میں شمار ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن افسوس ہے یہ سب موضوع ابھی تک تشنہ پڑے ہیں۔

ہندوستانی نکتۂ نظر سے اوّل الذکر موضوع یعنی "امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر" سب سے اہم ہے۔ لیکن تقریباً سات سو سال کی تخریب کاری اور قوم کی شرمناک بے حسی نے خسرو کے ہندی کلام کو بالکل تباہ کر دیا ہے۔ اس مخصوص موضوع پر شاید

---

[1] بھارت کھنڈے کو موسیقی کا مجدد ثانی کہا جا سکتا ہے لیکن نائیک خسرو کے بعد ابھی تک نہیں ہوا۔

اثباتی انداز کی کوئی مستقل محققانہ تصنیف موجود نہیں۔ پچھلے پچاس سال میں علمی سطح پر امیر خسرو کی ہندی شاعری پر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ بیشتر منفی انداز کا ہے۔ اس عموم عہد کی جذباتی رو نے بات یہاں تک پہنچادی کہ خسرو کی مقبول ترین ہندی تصنیف خالق باری کا رشتہ بھی ان سے توڑنے کی کوشش کی گئی۔

ہندی میں خسرو پر اتنا کم لکھا گیا ہے جسے نہ لکھنے کے برابر سمجھنا چاہیے۔ ناگری لپی میں خسرو کے متعلق علم چند مستعار معلومات کے مضامین اور برج رتن داس کی ایک چھوٹی سی کتاب تک محدود ہے۔ وجہ اس کی کچھ بھی ہو لیکن بات افسوسناک ہے۔

میں خود اپنی اس کتاب میں خسرو کی ہندی شاعری کے متعلق بہت زیادہ نئی معلومات دینے کا دعویٰ تو نہیں کرسکتا لیکن یہ کوشش ضرور کروں گا کہ اس مخصوص موضوع کے ضمن میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں ان کو باقی نہ رہنے دیا جائے۔
خسرو کی فارسی سعدی و حافظ کی ہم پلہ تھی۔ لیکن جس چیز نے خسرو کو ہندوستان کے گھر گھر میں پہنچایا ہے وہ ان کی پہیلیاں 'خالق باری' گیت' دوہے اور دوسرا ہندی کلام ہے خسرو کی ہندی شاعری ان کا اور ہندوستانی عوام کا ایک ایسا مستحکم رشتہ جسے زمانے کی جذباتی ہواؤں میں اڑنے والے نقاد کبھی نہیں توڑ سکتے۔

ایک اعتبار سے خسرو کی ہندی شاعری کو ان کی فارسی شاعری پر فوقیت حاصل ہے۔ فارسی میں خسرو کو ظالم اور جابر بادشاہوں کی جھوٹی تعریف سیاست۔ رواج اور ضرورت سے مجبور ہو کر کرنا پڑتی تھی۔ لیکن ان کی ہندی شاعری ایک آزاد نغمہ ہے۔ جس پر نہ شاہی جبروت کا دباؤ ہے نہ سیاست کا بوجھ۔ وہ ہندی میں جو کچھ کہتے تھے صرف اپنے عوام کے لئے کہتے تھے جس کا معاوضہ زر و مال کی صورت میں نہیں۔ عقیدت اور محبت کی صورت میں ملتا تھا۔ کاش فارسی کی طرح خسرو کا ہندی کلام بھی باقی ہوتا۔

اس کتاب میں جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے اسے آج سے پانچ سال پہلے ایک مضمون کی صورت میں لکھا گیا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں "اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی" کی دعوت پر میں نے اس مضمون کا ایک حصہ "خالق باری" ایک خصوصی اجتماع میں پڑھا۔ اس مضمون میں امیر خسرو کی تصنیف خالق باری کے متعلق پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کے منفی نظریے کو بالتفصیل رد کیا گیا تھا۔

اس اجتماع میں کچھ پروفیسر حضرات، کچھ ادیب اور کچھ ریسرچ کے طالب علم موجود تھے۔ مضمون ختم ہونے پر حاضرین کو دعوت تنقید دی گئی۔ لیکن چند غیر متعلق باتوں کے علاوہ بنیادِ مضمون پر کوئی اعتراض نہ ہو سکا۔ کچھ عرصے بعد یہ مکمل مضمون دو قسطوں میں 'اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے رسالے نوائے ادب بمبئی میں شایع ہوا۔ مدیر محترم پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی نے ایک خصوصی نوٹ لکھ کر یارانِ نکتہ داں کو دعوت تردید دی۔ میں نے چار سال انتظار کیا کہ کوئی تردید مکمل لے تو اپنے خیالات کی اصلاح یا جواب الجواب کے ساتھ اس مضمون کو کتابی شکل دوں۔ لیکن ابھی تک کوئی تردیدی مضمون نہیں شایع ہوا۔ لہٰذا اب میں نظرِ ثانی کر کے اپنے مضمون کے مواد کو بعض ترمیموں اور اضافوں کے ساتھ اس کتاب کی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔

واضح رہے اس کتاب کا موضوع صرف خسرو کی ہندی شاعری ہے۔ لہٰذا خسرو کے متعلق دوسرے مباحث کو بالکل چھوڑ دیا گیا ہے۔ آگے کے پانچ سات صفحوں میں خسرو کی زندگی کے کچھ اہم واقعات مختصراً درج کر دئے گئے ہیں۔ تاکہ انکے ہندی کلام کو ان کے عہد کے پس منظر پر دیکھا جا سکے۔

امیر خسروؒ کی زندگی

امیر خسروؒ کے والد امیر سیف الدین ترکوں کے لاچین قبیلے کے سردار تھے۔ چنگیزی فتنوں کے زمانے میں یہ اپنے وطن کش (ماوراء النہر) سے ہندوستان آئے اور یو۔پی میں گنگا کے کنارے ایک قدیم قصبے پٹیالی ضلع ایٹہ میں آباد ہو گئے۔ پٹیالی، دہلی سے زیادہ دور نہیں۔ اس وقت شمس الدین التمش دہلی کا بادشاہ تھا۔ امیر سیف الدین کو اس نے ایک معزز فوجی عہدہ دیا اور یہ اپنی کارگزاری کی بدولت اس درجے پر پہنچے کہ اس زمانے کے بادشاہ گر امیر اور رکن سلطنت عماد الملک کی لڑکی سے ان کی شادی ہو گئی۔

۶۵۱ھ مطابق ۱۲۵۳ء میں خسروؒ پٹیالی میں پیدا ہوئے ان کے دو بھائی اور تھے جن کے نام تاریخ میں صرف اس لئے محفوظ ہیں کہ وہ امیر خسروؒ کے بھائی تھے۔ خسروؒ کی ذہانت اور جودت طبع بچپن ہی سے ظاہر ہونے لگی تھی۔ امیر سیف الدین نے ان کی تعلیم کی طرف پوری توجہ کی۔ وہ اپنے ہونہار فرزند کو دلی لائے اور اچھے سے اچھے معلمین کے سپرد کیا۔ ساتھ ہی برکت کے لیے خواجہ نظام الدین اولیاء کے قدموں پر گرا کر ان کا مرید بھی کر دیا۔ خسروؒ نے بالغ اور باشعور ہو کر باضابطہ اس ارادت کی تجدید کی۔ ڈاکٹر وحید مرزا[1] اس ارادت کا سنہ عام روایات کے خلاف ۶۷۱ھ بتاتے ہیں۔ جب خسروؒ کی عمر بیس سال کی ہو گی۔ اس تجدید ارادت کے معنی یہ نہیں تھے کہ بیس اکیس[2] برس کے سن میں خسروؒ کٹھ ملا بن گئے

---

[1] "امیر خسرو" صـ ۱۶۱

وہ ایک جذباتی شاعر اور فنکار پہلے تھے اور کچھ اور بعد میں۔ خود انھیں کی تحریریں اپنی زندگی کے بعض دلچسپ پہلوؤں کی طرف اشارے موجود ہیں۔ جن کی چھان بین کرنا ان کے سوانح نگار کا کام ہوگا۔ میرے لئے یہ بحث خارج از موضوع ہے۔

اپنے مرشد کے فیوض سے یوں تو وہ ابتدائے عمر سے آخر عمر تک بہرہ یاب ہوتے رہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان کی باقاعدہ متشرع زندگی عمر کے پچاس سال گذرنے کے بعد شروع ہوئی۔ ان کے مرید ہونے کا سال ۷۱۰ھ یا ۷۱۳ھ بھی بتایا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مرشد کے سامنے کوئی مخصوص رسم ادا کرنے کے بعد اس زمانے سے ان کی متشرع زندگی شروع ہوئی ہو۔ دنیا سے برداشتہ خاطری کا رنگ ان میں اسی عہد سے نمایاں ہوا ہے۔

خسرو اور حسن کے جو واقعات بیان کئے جاتے ہیں میں انھیں لغو اور بے بنیاد سمجھتا ہوں حیرت ہے کہ مولانا شبلی جیسے ذوق لطیف رکھنے والے ادیب کو یہ واقعات لکھتے وقت ان کا تعفن محسوس نہیں ہوا۔ چند ادبی جملے یا اچھے شعر کسی واقعے میں کھپا دینے سے اس واقعے کی نوعیت بدل نہیں جاتی۔ حسن، خسرو کے عزیز ترین دوست، ہم مذاق بلند مرتبہ شاعر اور پیر بھائی تھے اور بس۔ اس بیہودہ کہانی کا ماخذ نہ جانے کہاں ہے؟

خسرو ابھی آٹھ سال کے تھے کہ ان کے والد کسی لڑائی میں مارے گئے۔ خسرو کی والدہ کو مجبوراً اپنے والد عماد الملک کے یہاں آنا پڑا۔ عماد الملک کا گھر ہندوستانی تہذیب کا مرکز تھا۔ اسی ماحول میں پڑھ لکھ کر خسرو بڑے ہوئے۔ ہندوی خسرو کی مادری زبان تھی۔ جس کے علاوہ وہ سنسکرت، فارسی، عربی، ترکی اور ہندوستان کی کئی صوبائی زبانیں جانتے تھے اور ساتھ ہی بہت سے علوم و فنون کے ماہر تھے۔ سترہ اٹھارہ برس کے سن میں وہ بحیثیت شاعر دہلی کی ادبی صحبتوں پر چھا گئے تھے۔ ان کی خوش الحانی ان کی حسین شاعری کا زیور تھی۔ جس مجلس میں وہ اپنا کلام پڑھتے تھے وہاں سناٹا چھا جاتا تھا۔

خسرو، عماد الملک جیسے رئیس اعظم کے چہیتے نواسے تھے۔ ظاہر ہے نانا کی زندگی بھر

عمر روزگار ان کے پاس نہ آسکا۔ لیکن ۶۷۱ھ ۱۲۷۲ء میں عماد الملک نے ۱۱۳ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ جس کے بعد خسرو کے لئے فکر معاش ضروری ہو گئی ان کا معیار زندگی بہت بلند تھا اور اس معیار کو برقرار رکھنے کے لئے انھیں معقول آمدنی کی ضرورت تھی جس کا امکان صرف اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ وہ بادشاہ یا کسی امیر کبیر کی نوکری کریں۔

اس وقت خشک مزاج اور سخت گیر بادشاہ بلبن دہلی کے تخت پر تھا۔ وہ بھلا خسرو کی قدر کیا کرتا۔ لیکن بادشاہ کا بھتیجا کشلو خاں عرف ملک چھجو خسرو کا بے حد مداح تھا۔ خسرو کی پہلی ملازمت یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اس ملازمت کا سلسلہ دو سال تک جاری رہا جس کے بعد ملک چھجو اور خسرو میں غلط فہمی پیدا ہوئی اور خسرو نے یہ ملازمت ترک کر دی۔

ان کی دوسری ملازمت سامانے کے حاکم اور سلطان بلبن کے چھوٹے لڑکے بغرا خاں کے دربار میں ہوئی جو تین سال تک جاری رہی۔ ایک مہم کے سلسلے میں خسرو بغرا خاں کے ساتھ مشرقی ہندوستان کی بھی سیر کر آئے۔

تیسری ملازمت سلطان بلبن کے بڑے لڑکے سلطان محمد حاکم ملتان کے دربار میں ہوئی۔ یہ ملازمت پانچ سال تک جاری رہی۔ شاہی محل ہو یا میدان جنگ سلطان خسرو کو اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا۔ چنانچہ ۶۸۳ھ ۱۲۸۴ء میں جب وہ مغلوں سے لڑتا ہوا مارا گیا تو خسرو بھی اس کے ہمراہ تھے۔ مغل دوسرے قیدیوں کے ساتھ خسرو کو بھی گرفتار کر کے کشاں کشاں لے چلے۔ لیکن خوش قسمتی سے انھیں بھاگنے کا موقع مل گیا اور وہ پہاڑوں اور جنگلوں کے راستے کی مصیبتیں جھیلتے ہوئے دلّی واپس آئے۔

چوتھی ملازمت خسرو نے خان امیر علی حاکم اودھ کے دربار میں کی اور دو سال خان کے ساتھ اودھیا میں رہے۔ لیکن دوری کی وجہ سے اپنی والدہ کے حکم سے اس ملازمت کو ترک کرنا پڑا۔

پانچویں ملازمت سے خسرو دربار دلّی میں آگئے۔ اس وقت بغرا خاں کا نوجوان

لڑکا کیقباد تختِ حکومت پر تھا۔ اس نے خسرؔو کو ملک الشعراء کا خطاب دیکر بڑی عزت سے رکھا۔ ابھی اس ملازمت کو صرف ایک سال ہوا تھا کہ سلطان مرگیا۔

چھٹی ملازمت سلطان جلال الدین کے دربار میں ہوئی۔ اس سلطان نے خسرؔو کو ملک الشعراء کے ساتھ امیر کا لقب بھی دیا۔ اور ساتھ ہی مصحف داری کا عہدہ بھی دیا۔ یہ ملازمت تقریباً چھ سال رہی۔

ساتویں ملازمت سلطان علاء الدین خلجی کے دربار کی تھی۔ جو بیس سال (۶۹۵ھ سے ۷۱۵ھ) تک رہی۔ سلطان کے ساتھ مہموں پر جا کر خسرؔو نے جنوبی ہند اور دوسرے مقامات دیکھے۔

آٹھویں ملازمت سلطان قطب الدین کے دربار میں ہوئی اور چھ سال تک جاری رہی۔

نویں ملازمت ملک تغلق کے دربار میں تھی اور دو برس رہی۔

دسویں ملازمت ۷۲۳ھ (۱۳۲۳ء) میں محمد تغلق کے دربار میں ہوئی۔ اس حکومت میں ۹۵ سال کے سن میں خواجہ نظام الدین اولیاء کا انتقال ہوا خسرؔو اس وقت دلّی سے باہر تھے۔ جب انھیں اس جانکاہ سانحے کی خبر پہنچی تو وہ دیوانے کی طرح یلغار کرتے ہوئے دہلی پہنچے۔ اپنا سب کچھ راہِ خدا میں لٹا دیا اور تارک الدنیا ہو کر مرشد کی قبر پر جاروب کشی کرنے لگے۔ انھوں نے مرشد کی قبر دیکھ کر یہ دوہا کہا تھا ؎

گوری سوئی سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرؔو گھر آپنے رین بھئی چھو رکیس

آج بھی خواجہ نظام الدین اولیاء کے عرس کا افتتاح اسی ہندی دوہے سے ہوتا ہے۔

مرشد کے بعد خسرؔو چند ہی مہینے زندہ رہے۔ اور ۱۸ شوال ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) کو خود بھی دنیا سے چلے گئے۔ انکی قبر خواجہ صاحب کی پائینتی بنائی گئی۔ جو آج تک ہر قوم کی زیارت گاہ ہے

خسرو صاحب اقبال تھے اور اپنی ہر ملازمت میں اتنا احترام اور انعام و کرام پایا جو شاذ ہی کسی شاعر کو ملا ہوگا۔

خسرو کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر خواجہ نظام الدین اولیاء کا تھا۔ ایک صاحبِ کرامت بزرگ یا شیر کار دانش ور کی حیثیت سے وہ خسرو کے ہر شعبۂ حیات پر چھائے ہوئے تھے۔ خسرو کی حیرتناک زندگی کے متعلق بیسیوں سوال ایسے ہیں جن کا جواب انھیں خواجہ صاحب سے الگ کر لینے کے بعد مشکل ہی سے مل سکے گا۔

خسرو سویرے سے شام تک دربارداری کرتے تھے۔ رات کو دیر تک اپنے مرشد کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ احباب نوازی اور دوسری دلچسپیوں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے۔ اپنے ذاتی کام کاج کرتے تھے۔ اپنے بیوی اور بچّوں کو بھی کچھ وقت دیتے تھے وغیرہ وغیرہ اس کے بعد انھیں اتنا وقت کیونکر ملا کہ بھرپور فکر و تاثر کے ساتھ انھوں نے لاکھوں شعر کہہ ڈالے۔

یا

معمولی گائک بننے کے لئے زندگی بھر ریاض کرنا پڑتا ہو۔ موسیقی کے سب سے بڑے درجے نائیک تک پہنچنے کے لئے انھیں ریاض کرنے کا وقت کیونکر ملا۔ اور کس استاد کی زیر نگرانی انھوں نے ریاض کیا؟ ایسے ہی بیسیوں سوال ہیں جن کا جواب تاریخ کے اوراق نہیں دے سکتے۔ اگر ایک اعتقاد پرست یہ کہے تو بیجا نہ ہوگا کہ خواجہ نظام الدین اولیاء کو دنیا میں جو کچھ کرنا تھا۔ ان میں سب سے اہم کام خسرو سازی تھا۔

خواجہ صاحب تو خود کہتے تھے کہ قیامت میں جس وقت خدا مجھ سے پوچھے گا کہ دنیا سے کیا لایا تو میں خسرو کو پیش کر دوں گا۔ اگر کرامت کوئی چیز ہو تو خواجہ صاحب کی سب سے بڑی کرامت خسرو ہیں۔

خسرو کی تصنیفات کی تعداد بڑھا چڑھا کر ۹۹ تک بتائی جاتی ہو۔ لیکن ۱۹۱۵ء

میں سید حسن بلگرامی کے مشورے سے نواب اسحاق نے خسرو کی تصنیفات کی جو تحقیقاتی مہم چلائی تھی اس میں ان کی ۴۵ تصنیفات کے نام ملے۔ جن میں سے نظم و نثر کی کل ۲۸ کتابیں دستیاب ہو سکیں۔ انھیں ۴۵ کتابوں میں سے ایک نایاب کتاب "حالات کنھیا" ہے۔ نہیں معلوم یہ کتاب فارسی تھی یا ہندی۔ ایک اور نایاب کتاب "نزانہ ہندی" ہے جس پر ہندی ہونے کا گمان ہو سکتا ہے۔ حالانکہ ان دونوں کتابوں کے نام میں اضافت فارسی لگی ہوئی ہے جو بصورت ہندی نہ ہونا چاہیئے تھی۔ بہر حال یہ سب قیاس آرائیاں ہیں۔ حقیقت کیا ہے یہ کسی کو نہیں معلوم۔

خسرو کے یہ بیحد مختصر حالات صرف ان کے عہد کا پس منظر بتانے کے لئے تحریر کئے گئے ہیں۔

امیر خسرو کی ہندی شاعری

امیر خسرو کی فارسی شاعری کا جو احترام اور وقار ہے۔ ان کی ہندی شاعری کی عزت اس سے کسی طرح کم نہیں۔ ان کا ہندی کلام ہمارے قومی شعر و ادب کا نقش اول ہے۔ اردو، ہندی، ہندوستانی یا کھڑی بولی کی پہلی واضح شکل ہمیں خسرو ہی کی ہندی شاعری میں نظر آتی ہے۔

خسرو سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل ایک شاعر مسعود سعد سلمان لاہوری (۴۳۸ سے ۵۱۵ تک) ہوئے ہیں۔ پہلے تو وہ شاہی دربار سے متعلق رہے اس کے بعد چالیس سال کی عمر میں کسی سیاسی جرم میں ماخوذ ہوئے اور ۱۹ سال تک قید خانے میں رہے قید ہونے سے قبل و بعد اور قید کے دوران میں انھوں نے بہت کچھ کہا ہے۔

خسرو نے اپنے دیوان غرۃ الکمال کے دیباچے میں مسعود سعد کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کے تین دیوان ہیں۔ ایک عربی میں، ایک فارسی میں اور ایک ہندی میں۔ مسعود سعد کا فارسی دیوان اب بھی باقی ہے اور تقریباً آٹھ سو صفحات پر رشید یاسمی نے طہران سے شائع کیا ہے۔ لیکن ان کا عربی دیوان غالباً مفقود ہو چکا ہے۔ اور ہندی دیوان کا صرف ذکر ہی باقی ہے۔

مسعود سعد سلمان کے فارسی کلام سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ہندوستانی طرزِ فکر سے ایک لگاؤ تھا۔ اور ہندی میں غالباً انھوں نے بہت کچھ کہا ہوگا۔ خسرو کی شہادت کے بعد ان کا صاحبِ دیوان ہندوی شاعر ہونا یقینی بات ہے۔ لیکن

ان کے ہندوی کلام کا آج کوئی نمونہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ جس سے ہم ان کی زبان کے متعلق واضح رائے قائم کرسکیں۔ ہمارے علم میں ہمارے ادب کی ابتداء خسرو ہی کے کلام سے ہوتی ہے۔

خسرو کے ہندوی کلام کی مقدار خسرو کی حیرتناک مقدار کلام کو سمجھنے کے لئے ان کی زود گوئی، بدیہہ گوئی اور پرگوئی کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ خسرو اپنے چوتھے دیوان بقیۂ نقیہ کے دیباچے میں اپنی زود گوئی کے لئے کہتے ہیں کہ میں شعر اتنی دیر میں کہتا ہوں جتنی دیر میں لفظ بیت زبان سے ادا کیا جائے۔ امراء کی محفلوں کے لئے وہ کہتے ہیں کہ وہاں میں بیشتر قلم کا استعمال ترک کر دیتا ہوں۔ اور بدیہہ گوئی پر اکتفا کرتا ہوں۔

یہ بیان کسی یاوہ گو کا نہیں، خسرو جیسے متوازن انسان کا ہے۔ جو شاعری کے علاوہ اخلاق اور روحانیت کی دنیا میں بھی ایک مقام رکھتا ہے۔ ہمیں خسرو ہی کے بیان کی روشنی میں ان کی مقدار کلام کا اندازہ کرنا ہوگا۔

تذکرہ نویسوں نے خود خسرو کے قول کے مطابق ان کے فارسی کلام کی تعداد تین لاکھ ادبیات سے زیادہ اور چار لاکھ ابیات سے کم بتائی ہے۔ تذکرہ عرفات میں اوحدی کا بیان ہے کہ خسرو کا ہندی کلام اتنا ہی تھا جتنا ان کا فارسی کلام تھا۔ جس کے یہ معنی ہوئے کہ ان کے تین چار لاکھ شعر ہندی میں بھی ہوں گے۔ مولانا شبلی بیت کے پرانے معنی مصرع بتاتے ہیں اور خسرو کے اشعار کی تعداد نصف کر دینا چاہتے ہیں۔ خسرو کا کلام اگر نصف بھی کر دیا جائے تو بھی اتنا زیادہ ہے کہ شاذ ہی کسی شاعر کی مقدار کلام خسرو کے برابر ہو سکے گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا شبلی کا خیال درست نہیں ہے۔ خسرو کے عہد میں بیت کے معنی مطلع نما شعر کے تھے۔ خود خسرو نے بھی بیت کا لفظ انھیں معنوں میں اپنی تحریروں میں استعمال کیا ہے۔

جیسے اعجاز خسروی کے پہلے رسالے میں "نسبت ماجرائے آب" کی سرخی کے ضمن میں انھوں نے حسب ذیل مطلع کو بیت کہا ہے ؎

ابر می بارد و من می شوم از یار جدا
چوں کنم دل بہ چنیں وقت ز دل دار جدا

اسی اعجاز خسروی کے دوسرے رسالے میں اختتام تمہید پردہ اس مطلع کو بیت کہتے ہیں ؎

ایں قسم مایہ ہمہ در غرائب و شرق بین۔
دیں بیت در میانِ دو خط بہر فرق بین۔

خسرو اپنی تحریروں میں مصرعے کو صرف مصرع تحریر کرتے ہیں۔ مصرع کو انھوں نے بیت کسی جگہ نہیں کہا ہے۔ مولانا شبلی کی غلط فہمی کے باوجود اگر انھیں کے اندازے کو پیش نظر رکھا جائے تو خسرو کے ڈیڑھ دو لاکھ شعر فارسی کے اور اتنے ہی شعر ہندی کے ہونا چاہیئے۔

خسرو کے دو سو برس بعد جب میرزا بائیسنغر نے خسرو کا مکمل فارسی کلام مدوّن کرنے کا ارادہ کیا تو انھوں نے ایک لاکھ بیس ہزار شعر تک جمع کئے۔ لیکن اس کے بعد بھی میرزا کو معلوم ہوا کہ خسرو کے ہزاروں شعر ایسے ہیں جو ان کی بیاض تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ آخر تھک کر انھوں نے تدوین کا کام بند کر دیا۔

ڈاکٹر وحید میرزا کی تحقیق اور اندازے کے مطابق ایک شاعر سیفی، میرزا بائیسنغر کے معاونین میں تھا جس نے خسرو کا دیوان مدوّن کر کے اس پر دیباچہ بھی لکھا ہے۔ یہ دیوان "سینٹ پیٹرس برگ" کے کتبخانے میں اب بھی موجود ہے۔

اس دیوان کی تعداد اشعار معلوم نہیں، لیکن اگر سیفی، میرزا بائیسنغر کے معاونین میں تھا تو اس میں کم سے کم اتنے اشعار تو ہونا ہی چاہیئے۔ جتنے میرزا بائیسنغر

نے جمع کئے تھے۔ یعنی ایک لاکھ بیس ہزار شعر۔

خسرو کے فارسی اشعار آج بھی کافی تعداد میں موجود ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کی مادری زبان ہندوی کے تین چار لاکھ اشعار میں سے بہ شمول خالق باری ان کے چار پانچ سو شعر ہمارے پاس باقی رہ گئے ہیں۔ پھر ان باقیات کی اگر محققانہ جانچ کی جائے (جو بہت مشکل ہے) تو یہ تعداد دو سو تک بھی بہ مشکل جا سکے گی۔ خسرو جیسے عظیم شاعر کا اتنا بڑا ذخیرۂ کلام ضائع ہو جانا ایک جانکاہ ادبی سانحہ ہے جس کے لئے وقت کی بدعنوانیوں کو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔

خسرو کا ہندی کلام کیوں ضائع ہوا

ڈاکٹر وحید مرزا نے اپنی کتاب "امیر خسرو" میں خسرو کا ہندی کلام ضائع ہونے کا سبب بہ حوالۂ دیباچہ غرۃ الکمال یہ بیان کیا ہے کہ خسرو کی نظر میں اپنے ہندی کلام کی کوئی وقعت نہ تھی لہٰذا انھوں نے اسے جمع کرنے کے بجائے دوستوں کو بانٹ دیا۔

مجھے ڈاکٹر صاحب کے اس بیان پر تعجب اور افسوس ہوتا ہے۔ دیباچۂ غرۃ الکمال میں کسی جگہ کوئی عبارت ایسی نہیں جس میں خسرو نے اشارتاً بھی اپنے ہندی کلام کو بے وقعت کہا ہو۔ صرف ایک جگہ احباب کو ہندی کلام نذر کرنے کا ذکر وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

"جزوِ چند نظمِ ہندوی نذرِ دوستاں کردہ شُد۔"

کتاب میں یہ فقرہ اپنی جگہ مکمل ہے۔ اس سے قبل یا اس کے بعد ایک لفظ بھی اس ضمن میں نہیں لکھا گیا ہے۔ خسرو کا اپنی چند ہندی نظمیں احباب کی نذر کرنا اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ان کا ہندی کلام بیحد مقبول تھا اور ان کے احباب ان ہندی نظموں کو حاصل کرنے کی فرمائش کرتے رہتے تھے۔

ڈاکٹر وحید مرزا کا یہ خیال بے بنیاد ہے کہ خسرو کا ہندی کلام ضائع ہونے کا سبب اس کی طرف ان کی بے اعتنائی ہے۔ درحقیقت اس معاملہ میں قصور اس عہد کے پست ذہنیت

ماحول کا ہے جس میں کسی زبانوں کی تو عزت تھی اور مادری زبانیں ہیچ اور بے وقعت سمجھی جاتی تھیں ایکطرف تو ہندوؤں کا مذہبی طبقہ عوامی زبانوں سے روگردانی کرکے مردہ سنسکرت کی سمادھی پر عقیدت کے پھول چڑھا رہا تھا۔ سنسکرت کو سب سے پہلے عوامی شاعر کبیر نے (۱۵۱۸ء)

سنسکرت کوپ۔ جل بھاکھا بہتا نیر

دوسری طرف مسلمان اور درباری لوگ اپنی مادری زبان کو بھول کر فارسی اور عربی کے غلام بن گئے تھے۔ ادبی صحبتوں اور درباروں پر فارسی چھائی ہوئی تھی اور شعر سننے سنانے کا کام اسی زبان میں ہوتا تھا۔ اس صورت میں خسرو کا فارسی کلام تو محفوظ ہو سکتا تھا۔ لیکن ان کا ہندی کلام کون جمع کرتا؟

ہندوستانی ہونے پر خسرو کو فخر خسرو قصبہ پٹیالی میں گنگا کے کنارے پیدا ہوئے اور شہر دہلی میں جمنا کے کنارے مر گئے۔ وہ ہندوستانی تھے۔ ان کی والدہ ہندوستانی تھیں۔ کثرت سے پان کھانے والے۔ ان کے سلونے سانولے نانا عماد الملک کا گھرانا ہندوستانی تہذیب و معاشرت کا ایک معیاری نمونہ تھا۔ ان تمام باتوں پر خسرو نے جابجا فخر کیا ہے۔

اس زمانے میں خسرو کی مادری زبان ہندوی کا عہد طفولیت تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی فارسی کے لئے غالب کی طرح۔ ع۔

"فارسی بیں تا بہ بینی نقشِ ہائے رنگ رنگ"

کا نعرہ نہیں لگاتے، وہ تو فخر کے ساتھ کہتے ہیں ؎

چو من طوطیِ ہندم ار راست پرسی
ز من ہندوی پرس تا نغز گویم

خسرو کی فارسی کو اہل ایران نے سعدی اور حافظ کی زبان کا درجہ دیا ہے۔ لیکن پھر بھی انھیں اپنی مادری زبان میں اظہارِ مطالب کی قدرت زیادہ نظر آتی ہے۔ جس کا اشارہ

اوپر کے شعر میں "... تا نغز گویم" کے ٹکڑے میں ملتا ہے۔

فارسی کی طرح خسرو عربی پر بھی قادر تھے۔ لیکن انھیں اپنی مادری زبان ہندوی عربی سے بھی بہتر معلوم ہوتی ہے۔

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم چو آب
شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن

خسرو اپنی پدری زبان ترکی پر بھی ہندوی کو ترجیح دیتے تھے۔

انیان گفت ہند بہ حجّت کہ راجح است
بر پارسی و ترکی از الفاظ خوش گوار

ظاہر ہے اس زمانے میں بیچاری ہندوی کیا ہوگی۔ لیکن خسرو کی دوربیں نظروں نے اس زبان کا مستقبل دیکھ لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس نوزائیدہ زبان میں فارسی اور عربی سے زیادہ امکانات موجود ہیں۔ آج خسرو کی یہ پیشین گوئی آخر سچ ثابت ہوئی۔

ہندی کی طرح 'ہندوستانی فارسی' پر بھی خسرو کو ناز تھا۔ غالب کا ایسا بے عدیل فارسی گو شاعر ایک فرضی اور خیالی ایرانی عالم عبد الصمد سے رشتۂ تلمذ جوڑ کر اپنی فارسی کو مستند منوانے کی کوشش کرتا ہے جس سے غالب کے احساسِ کمتری کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن خسرو ہندوستانی فارسی کو ایرانی فارسی سے کم نہیں سمجھتے۔ وہ اعجازِ خسروی کے پہلے رسالے میں "نسبت آب بیں رداں ولطیف" کی سرخی کے ذیل میں لکھتے ہیں:۔

ہندوستان میں قدیم طرز کی فارسی موجود ہے لیکن ساتھ ہی دریا دلانِ ہند نے ایک نئی روش کی فارسی جاری کی ہے جس میں صنائع اس طرح آتے ہیں۔ جیسے قند کی چاشنی میں پانی ملا دیا جائے۔ ماوراء النہر اور خراسان کے تخم شکن اس چاشنی سے بے بہرہ ہیں۔ (مقتبس)

اعجازِ خسروی کے اسی رسالے میں "نسبت بخشن الوانِ نغم" کی سرخی کے ذیل میں وہ "پرانی فارسی کے لیے لکھتے ہیں:۔

"بہ ترکانِ نخچیر گیر صحرا اور ہندوان ماہی گیر دریا کے کھانے کی طرح بدمزہ ہے۔" (مقتبس)

غرۃ الکمال کے دیباچے میں وہ ایرانیوں کے تفاخرِ بلادت کیلئے کہتے ہیں:۔

"بعض اہلِ ایران نے جو بلائے بلادت میں گرفتار ہیں میری فارسی پر نکتہ چینی کی۔ میں نے بھی یہی چاہا کہ ان احمقوں کو صرف سکوت سے جواب دوں۔ (مقتبس)

خسرو ہندوستان کو روم وعراق وخراسان سے بہتر سمجھتے تھے:

ترجیح ملکِ ہند بہ عقل از ہوائے خوش

بر روم دیر عراق وخراسان برف بار

خسرو کے نزدیک دانشورانِ ہند کے سامنے عجم کے اہل حکمت ہیچ ہیں

ترجیح اہل ہند بر اہل عجم ہمہ

در زیرکی و دانش و دلہائے ہوشیار

خسرو نے اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں ہندوستان کی فضیلت پر دس حجتیں قائم کی ہیں:۔

حجتِ اول[۱] ۔ ہندوستان میں علم ہر ملک سے زیادہ ہے۔

حجتِ دوم[۲] ۔ ہندوستانی دنیا کی تمام زبانیں (صحت کے ساتھ) بول سکتا ہے لیکن دوسرے ملک والے زبانِ ہند (صحیح) نہیں بول سکتے۔

حجتِ سوم[۳] ۔ ہندوستان میں لوگ ہر جگہ سے تحصیل علم کے لیے آئے۔ لیکن کوئی برہمن تحصیل علم کے لئے کہیں نہیں گیا۔ ابو معشر نے فن نجوم کی تعلیم یہیں حاصل کی۔

حجتِ چہارم[۴] ۔ ریاضی میں صفر ~~صحیح~~ ہندوستانی برہمن آسا کی ایجاد ہے۔

حجتِ پنجم[۵] ۔ دمنہ کلیلہ قدیم ہندوستان کی تصنیف ہے۔ جس کے ترجمے دوسری زبانوں (عربی فارسی۔ ترکی) میں ہوئے۔

حجتِ ششم[۶] ۔ شطرنج ہندوستان کی ایجاد ہے۔

حجتِ ہفتم[۷] ۔ ہندسہ، دمنہ اور شطرنج یہ تینوں ہند کے گھر گھر کی رونق ہیں۔

حجت ہشتم۸ - سرود نوازی ہندوستان کی ایسی سارے جہاں میں نہیں۔
حجت نہم۹ - یہاں کی موسیقی آہوانِ صحرا کو بھی مدہوش کر دیتی ہے۔
حجت دہم۱۰ - ہندوستان کے خسرو کا ایسا شاعر ساری دنیا میں نہیں ہے

حجت دہ۱۰ آں کہ چو خسرو بہ سخن
سحر گری نیست تہہ چرخ کہن

خسرو نے ایک کتاب مناقب ہند میں لکھی تھی۔ جس کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ لیکن اب یہ کتاب بالکل نایاب ہو گئی ہے۔ ان کی مختلف تصنیفات میں ہندوستان کی مدح سرائی بڑے دلکش انداز میں موجود ہے۔ علی الخصوص مثنوی نہ سپہر میں انھوں نے چار پانچ سو شعر ہندوستان کی تعریف میں کہے ہیں۔ جو ہر اعتبار سے منفرد ہیں۔

خسرو سچے وطن پرست اور ہندوستان کے عاشق تھے۔ اپنے اشعار میں جہاں جہاں وہ ہندوستان کی تعریف کرتے ہیں تو جیسے ان کی روح بول اٹھتی ہے۔ ہندوستان کی زمین، ہندوستان کے موسم، ہندوستان کے پرندے، ہندوستان کے پھول، ہندوستان کے ریت رواج، ہندوستان کے دانشور وغیرہ پر جس تاثر سے خسرو نے شعر کہے ہیں اس کی مثال غالباً سنسکرت سے لیکر ہندی اور اردو تک کسی ہندوستانی زبان میں نہ مل سکے گی۔ حالانکہ خسرو کے عہد میں وطن اور وطنیت کا شعور بالکل نابالغ اور ناپختہ تھا۔

خسرو کی بے عدیل ذاتی صلاحیت اور ہندوستان سے ان کے بے پناہ خلوص کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اپنے لاکھوں ہندوی اشعار میں انھوں نے کیا کچھ کہا ہوگا۔ خسرو کا جو کچھ بھی کلام اس وقت باقی ہے اس کا بہت کم حصہ اہلِ ذوق کی بیاضوں سے اور بیشتر حصہ عوام کے سینوں سے ہم تک پہنچا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کا تھوڑا حصہ خالص ادبی رنگ کا ہے اور زیادہ حصہ عام پسند انداز کا ہے۔

ادبی رنگ خسرو کے موجودہ ہندی کلام میں صرف دو دوہے، ایک غزل، اور

ایک قطعہ خالص ادبی رنگ کے ہیں۔ غیر مستند روایات کے مطابق اس تعداد میں کچھ اضافہ ہو سکتا ہے لیکن یہ روایات قابل اعتبار نہیں۔ دو دوہے حسب ذیل ہیں ؎

(۱)

گوری سوئی سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے رین بھئی چہوں دیس

(۲)

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرا۔ من پیو کا دو بھئے اک رنگ

ان دونوں دوہوں میں خسرو کا وہ سوز تغزل کی صورت میں نظر آتا ہے۔ جس کا واسطہ دیکر خواجہ نظام الدین اولیا خدا سے دعا مانگتے تھے۔[1] سنسکرت کا شرنگار اس رنگ سے الگ ہوتا ہے۔ دوہے ہندی میں غزل کا نعم البدل ہیں۔ اس صنف میں بھی غزل ہی کی طرح ایک خیال صرف دو مصرعوں میں ادا کیا جاتا ہے۔ کئی صدیوں تک دوہا ہندی شاعری کی مقبول ترین صنف رہا ہے۔ دوہے کا وجود سنسکرت میں نہیں۔ "یہ حسین صنف" آپ بھرنش کی دین ہے۔

ایک اور بڑا خوبصورت دوہا خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے ؎

سجن سکارے جائیں گے نین مریں گے روئے
بدھیا ایسی رین کر بھور کدی نا ہوئے

اس دوہے کو خسرو سے منسوب کرنے کی شہادت قطعاً ناقص اور ناکافی ہے۔ لیکن اس کا معیار خسرو ہی کی سطح کا ہے۔ دیباچۂ فرہنگ آصفیہ میں یہ دوہا خسرو کے ہم عہد شاعر بوعلی شاہ

---

[1] خواجہ نظام الدین خسرو کو سامنے بٹھا کر دعا مانگتے تھے کہ "پروردگار اس ترک بچے کے سوز دل کا صدقہ مجھے بخش دے۔"

قلندر سے منسوب کیا گیا ہے۔ اور مرقوم ہے کہ مبارز خاں کے کسی سفر کو ملتوی کرانے کے لئے بو علی شاہ قلندر نے یہ دوہا اور اس کا حسبِ ذیل منظوم فارسی ترجمہ ان کو لکھ کر بھیجا تھا ؂

من شُنیدم یار من فر دار ود در راہِ شتاب
یا الٰہی تا قیامت بر نہ آید آفتاب

ان دوہوں کے علاوہ خسرو کی مشہور غزل "زحال مسکیں" بھی خالص ادبی زمرے کے تحت آتی ہے۔ اس غزل میں خسرو کا سوز سب سے زیادہ نمایاں ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی کی طرح بھاکھا پر بھی قادر تھے۔ یہ غزل سب سے پہلے ۱۸۵۲ء میں ڈاکٹر اسپرنگر[1] نے اپنے مضمون میں شائع کی ہے۔ لہٰذا میں اس کا متن اسپرنگر ہی کے مضمون سے نقل کرتا ہوں ؂

زحالِ مسکیں مکن تغافل۔ درائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں نہ دارم اے دل نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
چو شمعِ سوزاں، چو ذرّہ حیراں، ہمیشہ گریاں بعشقِ آں ماہ
نہ نیند نیناں۔ نہ انگ چینا، نہ آپ ہی آوے، نہ بھیجے پتیاں
شبانِ ہجراں دراز چون زلف و روزِ وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں، تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل بصد فریبم، بہ برد چشمش قرار و تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سنا دے، پیارے پیو کو ہماری بتیاں
بحقِ روزِ وصالِ دلبر، کہ داد مارا فریب خسرو
دُرآئے راکھوں سمیت ساجن، جو کہنے پاؤں دُو بول بتیاں

اس غزل کے متن میں تھوڑے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ میرے لئے یہ کہنا مشکل ہوگا کہ

---

[1] اسپرنگر کے مضمون کا ذکر آگے آئے گا۔

ان میں صحیح ترین کسے سمجھا جائے۔ اسپرنگر کے مضمون ۱۸۵۲ء سے تقریباً سو سال قبل بھی یہ غزل خسرو ہی کی سمجھی جاتی تھی۔ میرے پاس ۱۱۳۴ھ کا لکھا ہوا بوعلی شاہ قلندر کا ایک قلمی دیوان ہو جس کے پہلے ہی صفحے پر امیر خسرو کے نام سے اس غزل کا پہلا دوسرا اور پانچواں شعر درج ہو۔ جس کا متن جا بجا اسپرنگر سے مختلف ہو۔

اس غزل میں فارسی اور بھاکھا[1] کی آمیزش ہو۔ اس کے علاوہ خسرو کا دو شعر کا ایک قطعہ فارسی اور ہندوی کی آمیزش کا ہو۔ جسے تذکرہ نکات الشعراء میں میر تقی میر نے اور تذکرہ نکات میں قائم نے اور قائم کے حوالے سے اسپرنگر نے نقل کیا ہو۔

زرگر پسرے چو ماہ پارا
کچھ گھڑھیے۔ سنواریے۔ پکارا
نقدِ دلِ من، ربود و بشکست
پھر کچھ نہ گھڑھا۔ نہ کچھ سنوارا

ان دو دوہوں، ایک غزل اور ایک قطعہ کے علاوہ ادبی رنگ میں خسرو نے نہ جانے کیا کچھ کہا ہوگا۔

نکات الشعراء میں میر تقی میر نے خسرو کے لئے لکھا ہو۔

"اشعار ریختہ آں بزرگ بسیار دارد۔"

اس کے یہ معنی ہوئے کہ عہدِ میر تک غالباً خسرو کا ادبی رنگ کا ہندوی کلام کافی موجود ہوگا۔ جو اب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو چکا ہو۔ ذوقِ اعلیٰ رکھنے والے نازک مزاج میر تقی میر جیسے لوگوں کو اشعار ریختہ کا مرتبہ دینے والے نہیں ہیں۔

عام پسند رنگ: خالص ادبی کلام کے علاوہ خسرو کا تمام ہندی کلام عوام کے ذریعے

---

[1] بھاکھا اور ہندوی کا فرق آگے بیان ہوگا۔

ہم تک پہنچا ہے۔ اور عام پسند رنگ کا ہے۔ اس کلام کو پست اور رکیک کہہ کر نظر انداز کرنے والے نقاد قابل رحم ہیں۔ وہ بیچارے روایات کے اس بری طرح غلام ہیں کہ حسن و لطافت کو اپنے فرسودہ رواجی معیاروں سے ہٹ کر دیکھ ہی نہیں سکتے۔ خسرو کے عام پسند کلام میں بھی وہ خصوصیات ہیں جن کو ایک بڑا شاعر ہی پیدا کر سکتا ہے۔

۱۔ خسرو نے اپنے اس کلام کو عام پسندی کی سطح پر رکھتے ہوئے بھی اس میں نوک کے بھدے اسلوب کی جگہ ایک شائستگی اور تہذیب بیان کو برقرار رکھا ہے۔ یہ کام کسی زبان کی غیر ترقی یافتہ حالت میں بیحد دشوار ہوتا ہے۔

۲۔ یہ کلام سہل ممتنع کا بہترین نمونہ ہے۔ جس کے لئے کہا گیا ہے ؎

فَاِذَا قِیلَ اَطْمَعُ النَّاسَ طُرًّا

وَاِذَا اُرِیدَ ۔ اَعْجَزُ الْمُعْجِزِیْن

جب اسے پڑھا جائے تو عام پسند (عامیانہ) معلوم ہو۔ لیکن جب ایسا کہنے کا ارادہ کیا جائے تو معجز بیان عاجز ہو جائیں۔

۳۔ اس کلام میں تعلیم لغات فارسی و ہندی کا مفید سلسلہ انتہائی دلچسپ انداز میں جاری ہے۔ جیسے حسب ذیل آئینے کی پہیلی۔ جس میں تینوں زبانوں میں آئینے کا نام موجود ہے لیکن پڑھنے والے کو پتہ نہیں چلتا۔

فارسی بولی آئی نہ (آئینہ)

ترکی بولی پائی نہ (پائینہ)

ہندی بولو آرسی آئے (آرسی)

کہے خسرو کوئی بتلا دے

۴۔ اس کلام میں وہ نئے نئے اسلوب اور انداز ہیں جو خسرو سے پہلے کسی نے نہیں برتے جیسے یہ مکرنی ؎

سگری رین مورے سنگ جاگا
بھور بھئی تو بچھڑن لاگا
وا کے بچھڑے پھاٹت ہیا
اے سکھی ساجن ؟ - نا سکھی دیا

ذرا دیکھئے کس خوبصورتی سے شرنگار رس سے ہاسیہ رس[۱] میں پہنچے ہیں۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نئی نویلی دلہن کے دل سے رس کی بوندیں ٹپکیں اور ہنسی کا زعفران زار کھل گیا۔ پھر مضمون کتنا اچھوتا ہے۔ آخری مصرعے میں مکالمے کا رنگ بالکل نئی بات ہے۔

۵۔ اس کلام کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندی کے باوجود مسلم طریقۂ فکر اور مسلم معاشرت کا رنگ بھی نظر آتا ہے جو عام ہندی شاعری میں مفقود ہے۔

شاعر اعظم کبیر نسلاً مسلمان ہیں۔ لیکن ان کا سارا سرمایۂ فکر ہندوانہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی ادھیاتمک شاعری میں بعض ژرف نگاہوں کو کچھ نا تراشیدہ مسائل تصوف نظر آجائیں۔ ملک محمد جائسی، رس کھان اور خان خانان وغیرہ کی بھی کم و بیش یہی حالت ہے۔ ان شاعروں کا کلام بے عدیل اور بے مثل ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کلام کو ہندوستانی مسلم معاشرے سے کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ اس کے برعکس خسرو کا ہندی کلام ہندوی روایاتِ شاعری کے مطابق ہے۔ اس میں عشق عورت کی طرف سے ہے۔ اس کے ریت رواج ہندوستانی ہیں۔ لیکن اس کی زبانِ بیشتر وہ ہندی ہے جو یہاں کے مسلمان بولتے تھے۔ نیز اس کے بھاؤ میں مسلم معاشرے کی ایک جھلک موجود ہے۔ ساون میں نئی بیاہی دلہن اپنے میکے جاتی ہے یہ رسم یہاں کے ہندو اور مسلمانوں میں مشترک ہے۔ خسرو ساون کی ملہار گیت کے وزن پر ایک مسلمان دلہن کی زبانی پیش کرتے ہیں ؎

---

۱ رومان ۲ ظرافت

امّاں میرے بابا کو بھیجو جی ـــــ کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بابا تو بوڑھا ری ـــــ کہ ساون آیا
امّاں میرے بھیاّ کو بھیجو جی ـــــ کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بھیاّ تو بالا ری ـــــ کہ ساون آیا
امّاں میرے ماموں کو بھیجو جی ـــــ کہ ساون آیا
بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری ـــــ کہ ساون آیا

کتنا خالص ہندوستانی بھاؤ ہے، لیکن اس بھاؤ کے اظہار کا ذریعہ ایک مسلمان ذہن ہے۔ گیت میں امّاں، بابا، بیٹی، ماموں یہ سارے الفاظ وہ ہیں جو ہندی بولنے والے ہندوستانی مسلمان گھرانوں میں بولے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی گیت کا رنگ بھی مسلمانی ہے۔

ویدانت اگر ہندوستانی ذہن و دماغ کی معجز نما پرواز ہے تو دشنو بھاؤ یہاں کے آرٹ اور کلچر کا انتہائی دلکش حسن ہے۔ جس وقت صوفیائے کرام ہندوستان آئے تو انھوں نے ہندوستانی تفکر اور ہندوستانی کلچر کے حسن دونوں کو پوری طرح اپنایا۔ ویدانت اور تصوّف تو اتنے قریب آئے کہ بیشتر تاریخ فلسفہ لکھنے والوں کا یہی خیال ہے کہ تصوّف پر ویدانت کا کافی اثر ہے۔ اسی طرح وشنو بھاؤ بھی سیکڑوں سال سے تصوّف میں پہنچ گیا ہے۔

وشنو فلسفۂ عشق میں عورت عاشق اور مرد معشوق ہے۔ اپنے مرشد یا پیشوا سے عورت کے انداز میں اظہارِ عشق دراصل وشنو بھاؤ ہی کی ایک صورت ہے۔ اس رنگ میں ذرا خسرو کی ایک ہولی دیکھیے جس میں وہ اپنے مرشد نظام الدین اولیاء سے اظہارِ عشق کر رہے ہیں:-

دیاّ ری موہے بھجو یا ری
شاہ نظامؒ کے رنگ میں
کپڑے رنگے سے کچھ نہ ہوت ہے
یا رنگ منے تن کو ڈبو یا دی۔ دیاّ ری

اس بولی میں وزن گیت کے ہیں، بھاؤ وشنو ہیں، زبان ہندی ہے۔ لیکن پھر بھی اس میں ہندوستانی مسلمان کے طرزِ تخیل کا رنگ موجود ہے۔ ری۔ موتے ہے۔ بجھویا وغیرہ الفاظ بولی میں ہندو عورت کا انداز کردار ابھارنے کے لئے لائے گئے ہیں۔

ڈیڑھ دو سو سال کے اندر انگریزوں کی ریشہ دوانیوں سے ہندوستانی مسلمان کی سیاست کچھ بھی رہی ہو۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس کے معاشرے کے بنیادی رسم و رواج ہندوستانی ہیں اور کم و بیش ہندوؤں سے ملتے جلتے ہیں۔ بچہ ہونے سے شادی ہونے تک اور شادی سے موت تک مسلمان کے یہاں بھی گیت اور رہت ہیں جن کی کچھ اپنی خصوصیات ہیں ہندی ادب نے ان کو بالکل جذب نہیں کیا ہے۔ حالانکہ یہ معاشرہ بھی ہندوستانی تہذیب کا ایک پہلو ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر اور خسرو خسرو کے ہندی کلام کے ضمن میں ڈاکٹر اسپرنگر کا ذکر بے حد ضروری ہے۔ شمس اللہ قادری نے اپنی کتاب "اردوئے قدیم" میں خبر دی ہے کہ خسرو کے مختلف ہندی اشعار کا ایک مجموعہ اور دو سو پہیلیوں کا دوسرا مجموعہ اودھ کے شاہی کتب خانے میں موجود تھے، ان دونوں مجموعوں کو سامنے رکھ کر ایک مقالہ خسرو کی ہندی شاعری پر ڈاکٹر اسپرنگر نے ۱۸۵۲ء میں لکھا تھا۔

شمس اللہ قادری نے اپنی کتاب میں جو پہیلیاں خسرو کی نقل کی ہیں۔ ان کے لئے وہ کہتے ہیں کہ یہ اسپرنگر کے مذکورہ مضمون ہی سے ماخوذ ہیں۔ اس مضمون کے عینی شاہد ہونے کے باوجود وہ یہ نہیں بتاتے کہ ۱۸۵۲ء میں یہ مضمون کہاں شائع ہوا تھا۔

پہلے میرا خیال تھا کہ خسرو کے ہندی کلام کے جن مخطوطوں کا ذکر شمس اللہ قادری نے کیا ہے وہ کافی پرانے ہوں گے۔ ورنہ اودھ کے شاہی کتب خانے میں کیوں رکھے جاتے۔ ساتھ ہی مجھے یہ بھی شک ہوا کہ اسپرنگر نے کہیں ان نایاب نسخوں کو ولایت کی ہوا تو نہیں کھلادی۔ اپنا مضمون لکھتے وقت میں نے اسپرنگر کے ۱۸۵۲ء کے مضمون اور اودھ کے

شاہی کتب خانے کے مخطوطوں کی تلاش یہاں سے ولایت تک کروائی مگر کوئی نتیجہ نہ نکل سکا۔

اپنے مضمون کو میں نے جب کتاب کی شکل دینے کا فیصلہ کیا تو پھر اِس معمّے کو حل کرنے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے میں نے اسپرنگر کے کیٹلاگ کی ورق گردانی کی جس میں اس کا صرف ایک مضمون خسرو کی فارسی شاعری پر ملا۔ اس مضمون میں کوئی خاص بات نہیں اور یہ میرے لئے خارج از موضوع بھی ہے۔ مجھے تو خسرو کے ہندی کلام کی تلاش تھی۔

اس کے بعد بمبئی یونیورسٹی لائبریری میں ۱۸۵۲ء کا جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال" ملا جس کے صفحہ ۵۱۶ سے صفحہ ۵۱۹ تک اسپرنگر کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ مقالے کا عنوان تھا۔

Has Sady Shyraz written Rekhta Verses.

اس مضمون میں خسرو کے ہندی کلام کا بھی ذکر تھا۔

اسپرنگر نے خسرو کے متعلق اپنی تحریر قائم کے حوالے سے شروع کی ہے جس سے اس کا مقصد "تذکرہ مخزنِ نکات قائم" ہے۔ اسپرنگر نے لکھا ہے کہ قائم نے (خسرو کے) دو شعر پیش کئے ہیں۔ کوئی پہیلی درج نہیں کی۔ میں قائم کے دیئے ہوئے اشعار میں سے ایک شعر پیش کرتا ہوں۔ اور وہ پوری غزل درج کرتا ہوں جس سے دوسرا شعر لیا گیا ہے۔" اس کے بعد خسرو کی مشہور غزل" زحالِ مسکیں مکن تغافل" اور۔ ان کا قطعہ "زرگر پسرے" نقل کیا ہے۔" تذکرہ مخزن نکات قائم" شائع کردہ انجمن ترقی اردوئے ہند اورنگ آباد ۱۹۲۹ء میں مذکورہ غزل کا کوئی شعر نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسپرنگر کے پاس مخزنِ نکات کا جو نسخہ تھا اس میں موجودہ نسخے سے زیادہ مواد تھا۔ یہ امتدادِ زمانہ کا اثر بھی ہو سکتا ہے اور بابائے اردو مولانا عبدالحق کی قطع و برید کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مولانا مرحوم کو ہندی مرغوب نہ تھی۔ شیرانی مرحوم کا خالق باری کے متعلق نظریہ مولانا ہی کے عطا کردہ نسخے پر مبنی ہے۔

اس کے بعد اپنے مضمون میں اسپرنگر نے کتب خانۂ توپ خانۂ لکھنؤ کے مخطوطے سے حسب

ذیل پہیلیاں نقل کی ہیں:-

(۱) خدا

سب کوئی اس کو جانے ہے
پر ایک نہیں پہچانے ہے
آٹھ دھڑی میں لکھا ہے
فکر کیا اور دیکھا ہے

(۲) خدا

سب سکھین کا پیا پیارا، سب میں ہو اور سب سوں نیارا
واکی آن مجھے یہ بھا، جاکی ہے بن دیکھی چاہ

(۳) نعت

ایک پُرکھ ہے دئی سنوارا
دنیا کا نستارن ہارا
واکے چرنوں لاگ رہو
زیادہ بچن نہ منھ سے کہو

(۴) چراغ

تیلی کا تیل - کمہار کا ہنڈا
ہاتھی کی سونڈ - نواب کا جھنڈا

(۵) خربزہ

دس ناری کا ایک ہی نر
بستی باہر، ہٹا کا گھر
بیٹھ بھنت، اور پیٹ نرم
منھ میٹھا، تاثیر گرم

(۶) حلال خور (بھنگی)

کمائی اپنی پھینک دے اور جی بہ نہیں ملال
واسے کیوں ہٹ جات ہیں جو روزی کھائے حلال

یہ پہلیاں خسرو کے ذخیرۂ کلام میں شامل نہیں ہیں اور اگر اب بھی نہ شامل کی جائیں تو بہتر ہی ان پہلیوں کو دیکھنے کے بعد اِن کے ماخذ لکھنؤ کے کتب خانۂ توپ خانہ کے مخطوطے کی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہتی۔

پہلی پہیلی کے مصرعۂ اوّل میں "سب کوئی" کی جگہ "ہر کوئی" ہونا چاہیے۔ ورنہ ردیف "ہے" کے بجائے "ہیں" ہو گی۔

دوسری پہیلی کے تیسرے اور چوتھے مصرع میں "بھا" اور "چا" مہمل ہیں۔

تیسری پہیلی بالکل معمولی ہو۔

چوتھی پہیلی میں "نواب کا جھنڈا" بتا رہا ہو کہ یہ پہیلی اودھ کے نوابی[1] عہد کی پیداوار ہو

پانچویں اور چھٹی پہیلیاں بالکل پیش پا افتادہ ہیں۔

اس کے بعد اسپرنگر نے لکھا ہو کہ دوسری پہیلیاں جو میں نے نقل کر کے رکھی ہیں انھیں ایک دوسرے مضمون میں پیش کروں گا۔ آگے بڑھ کر وہ "خالق باری" کا ذکر کرتا ہو۔

خود اسپرنگر کی تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ اس کا خسرو کی ہندی پر ایک اور مضمون بھی لکھنے کا ارادہ تھا۔ اس مضمون کی عینی شہادت شمس اللہ قادری دیتے ہیں۔ موجودہ ۱۸۵۲ء کے مضمون میں اسپرنگر نے صرف کتب خانۂ توپ خانہ کے اس مخطوطے کا ذکر کیا ہو جس میں یہ پہیلیاں درج تھیں۔ شمس اللہ قادری اسپرنگر کے ۱۸۵۵ء کے مضمون کے حوالے

---

[1] نواب کی ابتدا مصر میں ہوئی۔ یہ لفظ سلطانوں کے عہد سے ہندوستان آیا۔ لیکن اس عہد میں یہ لفظ عوام میں مقبول نہ تھا۔ بیشتر سرکاری کا غذات ہی اس لفظ کے امین تھے۔

سے ایک اور مخطوطے کا پتہ دیتے ہیں۔ جس میں خسرو کا ہندی کلام درج ہے۔
شمس اللہ قادری علمی حلقوں میں کافی نامعتبر سمجھے جاتے ہیں۔ ممکن ہو یہاں بھی انھوں نے داستان گوئی کی ہو۔ بہر حال اگر سچ مچ اسپرنگر نے کوئی اور مضمون خسرو کی ہندی پر لکھا ہو تو اس کی تلاش وقت کے سپرد کی جاتی ہے۔ اس معاملے میں میری مسلسل کوششیں ناکام رہیں۔

خسرو کے ہندی کلام پر شک پچھلے سو برس کے اندر اس ملک میں فرقہ پرستی کے جو طوفان آئے ہیں ان سے یہاں بسنے والوں کے ذہن ودماغ کافی مسموم ہوئے ہیں ایک طرف "ہندی، ہندو اور ہندوستان" کا نعرہ لگا تو دوسری طرف ہندی سے ضد یہاں تک بڑھی کہ اودھی اور برج بھاشا ایسی زبانوں کو بھی دہقانوں کی بولی بتا کر ان پر نظر کرنا بھی توہین ذوق سمجھا جانے لگا۔ خسرو کی باقی ماندہ ہندی کلام کی اہمیت گھٹانے میں بڑی حد تک اسی ذہنیت کا ہاتھ ہے۔

ستم تو یہ ہوا کہ بعض حضرات نے خسرو کے موجودہ ہندی کلام کو ان کی تصنیف ہی ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ اس بحث کے دو حصے ہیں۔ جس میں سے ایک حصہ خسرو کی مشہور نظم خالق باری سے متعلق ہے۔ مرحوم پروفیسر محمود شیرانی نے بڑی کاوش سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خالق باری کے مصنف امیر خسرو نہیں ہیں۔ شیرانی مرحوم کے اس نظریے پر آگے چل کر روشنی ڈالی جائے گی۔

یہ حقیقت ہے کہ خسرو کے بقیہ ہندی کلام میں تصرفات کا کافی دخل ہے۔ ہم اس کلام کے بعض اجزا پر اظہار اشتباہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس شبہے کی بنا پر خسرو کے سارے ہندی کلام کی نسبت ان سے توڑی نہیں جا سکتی۔

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ خسرو کثیر الکلام ہندی شاعر ہیں۔ لیکن تاریخ نے انھیں ایک ایسے عہد میں پیدا کیا جس وقت تک عوامی السنہ کے ادب کی تدوین شروع نہیں ہوئی تھی۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج بھی خسرو کا ہندی کلام باضابطہ صورت میں ہمارے

پاس باقی ہو۔ بلاشبہ یہ خسرو کی عظیم شخصیت کا اثر ہے۔

خسرو سے سو ڈیڑھ سو سال بعد عوامی شاعر کبیر پیدا ہوئے۔ ان کے کلام میں بھی تصرفات حد سے بڑھے ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود کبیر کا کلام آج بھی کبیر ہی سے منسوب ہے اور ادب عالم میں اس کا ایک مقام ہے۔ پھر معمولی تصرفات کی وجہ سے خسرو کے کلام کا رشتہ ان سے کیوں کر توڑا جا سکتا ہے۔

تحریفات اس وقت خسرو کا ہندی کلام "مشتے نمونہ از خروارے" سے بھی کم باقی رہ گیا ہے۔ یہ تقلیل بجائے خود استناد کی ایک دلیل مانی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود چونکہ یہ کلام سات سو سال سے عوام کے غیر علمی ماحول میں ہے۔ لہٰذا اس میں تحریفات کا ہو جانا ایک یقینی امر ہے۔ بغیر عالمانہ نگرانی کے جن ادب پاروں کے امین آزاد ذہن عوام ہوتے ہیں ان میں ہمیشہ اس طرح کی تحریفیں ہو جاتی ہیں۔

یہ سچ ہے کہ خسرو کے ہندی کلام کو اب تحریف اور تصرفات سے یک لخت پاک کرنا ناممکن ہے۔ لیکن پھر بھی محققانہ جانچ پڑتال سے تحریف و تصرف کے اجزا کسی نہ کسی حد تک الگ ہو سکتے ہیں۔ مثلاً بندوق کی حسب ذیل پہیلی محققین کی نظر میں قطعاً خسرو کی نہیں ہے کیونکہ ان کے عہد میں بندوق رائج نہیں ہوئی تھی ؎

ایک نار دو اُنگھ کھاوے ٭ جس پر تھوکے وہ مر جاوے

اس کا پیا چھاتی سے لگاوے ٭ اندھا نہیں کانا ہو جاوے

مطلب کی غلطی کے علاوہ اس پہیلی کے چاروں مصرعوں میں ایک پھوہڑ پن ہے اور خسرو ایسا بے سلیقہ تھے۔

ڈاکٹر وحید مرزا نے کچھ اور پہیلیوں پر اظہار اشتباہ کیا ہے۔ جیسے آئینے کی پہیلی:-

ہاتھ میں لیجے دیکھا کیجے

ڈاکٹر صاحب نے اپنے شبہے کا سبب نہیں بتایا۔ میں تو اس پہیلی کو خسرو سے اس لئے منسوب

نہیں کرسکتا کہ اس کا مضمون ناقص ہے۔ ہاتھ میں لیجیے۔ دیکھا کیجیے" کسی بھی اچھی چیز کے لئے کہا جاسکتا ہے۔ اس پہیلی کا لازمی جواب آئینہ نہیں ہوسکتا۔

حقّے اور چلم کی یہ پہیلی بھی ڈاکٹر صاحب مشکوک سمجھتے ہیں ؎

نئی کی ڈھیلی - پرانی کی تنگ
بوجھو تو بوجھو - نہیں چلو مرے سنگ

خسرو کے زمانے تک حقّے اور چلم کا رواج نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحب اسے خسرو کی پہیلی نہیں مانتے۔ میرے نزدیک نئی کی قیمت ڈھیلی اور پرانی کی قیمت تنگ (تقریباً دمڑی) کا لازمی جواب حقّہ اور چلم نہیں ہوتا۔ دھیلے کی نئی اور دمڑی کی پرانی سیکڑوں چیزیں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً ہانڈی جو زیادہ قرین قیاس ہے۔ لیکن اس پہیلی میں کوئی ذہانت اور جودت نہیں ہے۔ لہٰذا میں اسے خسرو سے منسوب کرنے پر اصرار نہیں کروں گا۔

ڈاکٹر وحید مرزا نے ایک اور پہیلی جوڑیوں کی نقل کی ہے ؎

چٹاخ پٹاخ کب سے
ہاتھ پکڑا ہے جب سے

اس پہیلی کے چار مصرعے اور ہیں جن میں ذم کا پہلو آگیا ہے۔ شاید ڈاکٹر صاحب اسی لئے اسے خسرو سے منسوب کرنا نہیں چاہتے۔

میں اس معاملے میں ڈاکٹر صاحب سے اختلاف نہیں کروں گا۔ لیکن یہ بھی عرض کردینا ضروری ہے کہ خسرو ہندی اور فارسی دونوں میں ایسی ساقط از تہذیب شوخیاں کر گئے ہیں۔ یہ بات صرف خسرو ہی کے یہاں نہیں۔ ہند و ایران کے بڑے بڑے اساتذہ کے یہاں بھی جا بجا نظر آتی ہے۔ شاید پرانے لوگ ادب و شعر میں سلیقے سے آجانے کے بعد ذم کو صرف شوخیٔ طبع سمجھتے تھے۔

اس عہد کے مشہور محقق قاضی عبدالودود صاحب نے ایک مضمون " آزاد بحیثیت محقق

شائع شدہ "نوائے ادب بمبئی" میں خسرو کے بنائے ہوئے چھمو ساقن کے اس ڈھکوسلے پر اظہار شک کیا ہے ؎

اوروں کی چوپہری باجے چھمّو کی آٹھ پہری
باہر کا کوئی آئے ناہیں آئیں سارے شہری
صاف صوف کر آگے رکھے جس میں ناہیں تو سل
اوروں کے جہاں سینگ سماوے چھمّو کے وہاں موسل

بھانگ بیچنے والی چھمّو ساقن پر گڑھا ہوا یہ ایک ڈھکوسلا ہے۔ جس کا واقعہ بیان کرنے میں مولانا محمد حسین آزاد نے اپنے عہد کی دلی کا رنگ پیدا کرنا چاہا۔ اور لکھ گئے کہ چھمو آتے جاتے خسرو کو حقہ پلاتی تھی۔ حالانکہ تمباکو اور حقہ خسرو کے عہد تک رائج نہیں ہوا تھا۔ اس غلطی کی بنا پر قاضی صاحب کا خیال ہے کہ چھمو کا ڈھکوسلا آزاد نے گڑھا ہے۔

میں قاضی صاحب سے اس حد تک ضرور متفق ہو سکتا ہوں کہ آزاد نے بات بڑھا چڑھا کر بیان کی ہے۔ لیکن چھمو ساقن کی مدح میں ڈھکوسلا بھی آزاد نے تصنیف کر لیا۔ یہ بات قابل قبول نہیں معلوم ہوتی۔ ہوگا یہ کہ یہ روایت آزاد کو مختصر اور بے کیف صورت میں ملی ہوگی جسے انھوں نے رنگ آمیزی کے ساتھ لکھ دیا۔ فن کار آزاد بھی محقق آزاد کے ساتھ برابر کلام کرتا رہتا تھا۔ بہرحال میں چھمو کے اس ڈھکوسلے کو خسرو ہی کا سمجھتا ہوں۔ حالانکہ شاعر نے چھمو کا ڈھکوسلا بھی چھمو ہی کی سطح کا گڑھا ہے۔

آب حیات میں خسرو کے تک بٹھانے کے متعلق ایک اور روایت بیان ہوئی ہے کہ خسرو ایک دن گھومتے پھرتے شہر کے باہر نکل گئے۔ وہاں کنوئیں پر چار پنہاریوں نے انھیں چار بے جوڑ لفظ۔ کھیر۔ چرخا۔ کتا اور ڈھول دیئے اور خسرو نے فی البدیہہ ان پر تک بٹھا دیا ؎

کھیر پکائی جتن سے چرخا دیا جلا
کتا آیا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا

اس نکتہ کو بعض لوگ خسرو کے لئے دونِ مرتبت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ چار بے جوڑ لفظوں کو فی البدیہہ ربط دیکر ایک بامعنی شعر بنا دینا خسرو جیسے مشاق ہی کا کام تھا۔ پھر شعر کا مضمون بھی پنہاریوں کی رعایت سے انھیں کے مذاق کا رکھا۔ جس سے وہ لطف اندوز ہو سکیں۔ غزلیات، قصائد، لیلیٰ مجنوں اور نہ سپہر کے مصنف کا سادگی کی اس حد تک آنا اس کے انتہائے کمال کی دلیل ہے۔ دیہاتی پنہاریوں سے حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ کا بات کرنا جنھیں پسند نہ ہو وہ پہلے شاعر کو دیکھے اور اس کی شخصیت کو پہچاننے کی نظر پیدا کریں۔

پنہاریوں کی طرح شاعر کو بے جوڑ لفظ دیکر اس سے بامعنی شعر کہلانے کا طریقہ اس زمانے میں عام تھا جب خسرو دس برس کے بچے تھے تو اسی طرح اس عہد کے عالم قاضی عزیز الدین کی فرمائش پر انھوں نے مو۔ بیضہ۔ تیر۔ خربزہ ان چار بے ربط لفظوں کو ایک فارسی رباعی میں فی البدیہہ نظم کیا تھا ؎

ہر موئے کہ در دو زلف آں صنم است

صد بیضۂ عنبریں برآں موئے ضم است

چوں تیر مداں راست دلش را زیرا

چوں خربزہ دندانش میانِ شکم است

بڑی اچھی رباعی ہے لیکن خسرو نے پنہاریوں کو جو تحفہ دیا ہے۔ وہ اس سے کہیں بہتر ہے۔

خسرو کے ہندی کلام میں نئے الحاق | عہد تاریک میں جب تحقیق و تفحص مفقود تھا خسرو کے ہندی کلام میں جو تصرفات ہوئے ہیں وہ ناگزیر ہیں۔ لیکن آج جب تحقیقی شعور کافی ترقی کر چکا ہے اس مجموعۂ کلام میں کوئی نیا الحاق معقول جانچ پڑتال کے بغیر قبول نہیں کیا جا سکتا۔

خسرو کا کچھ ہندی کلام تو ایسا ہے جو ان ہی کا مانا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ایسا ہندی کلام بھی ہے جو نادانستگی یا بے احتیاطی کی وجہ سے بعض لوگوں نے خسرو کی باقیات میں شامل کر دیا

ہو۔ اس اقدام پر اگر فوراً توجہ نہ کی گئی تو مستقبل میں تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے مزید شکلیں پیدا ہوں گی۔

خسرو کی متفقہ ہندی باقیات پر میں پچھلے صفحات میں اجمالاً اظہارِ خیال کر چکا ہوں اب ان الحاقات پر غور کیا جائے گا۔ جو جا بجا خسرو کے ہندی کلام کے ضمن میں مجھے نظر آئے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے میری نظر اردو کے صف اول کے محقق پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کی مایۂ ناز تصنیف "پنجاب میں اردو" پر جاتی ہو اور جی چاہتا ہو کہ اس معیاری کتاب سے وہ صفحات الگ کر دیئے جائیں جن میں پروفیسر سراج الدین آذر کی کسی بیاض سے خسرو کا حسب ذیل کلام طبع کرا کے مطبع کی روشنائی اور کتاب کا کاغذ خراب کیا گیا ہو۔

مفروضہ کلام خسرو ملاحظہ ہو:

وہ گئے بالم وہ گئے ندیو کنار
آپ پار اتر گئے ہم تو رہے اروار
بھائی رے ملاجو ہم کو پار اتار
ہاتھ دیونگی مندرا گلے کا دیونگی ہار
دیکھ میں اپنے حال کوں روؤں زار و زار
بے گن ذتا بہت ہیں۔ ہم ہیں او گنہار
بابل نے بھیجی ہیں ونج کون ناندار کی پھول
ہو جھا دنجہ دھا جیا نالاہا مول
چکوا چکوی دڈو جنے ان کو مارو نہ کو
اوہ مارے کرتار کے رین بچھوڑی ہو
سیج دجہتی دیکھ کے روؤں میں دن رین
پیا کرتی میں پھروں پل بھر سکھ نہ چین

سبہ نار بن سکھ سیویں کنتان کو گل لاء
میں دکھیاری جنم کی دو دکھی گئی بہاء
نازی چھوٹا دیس میں قصبے بڑی پکار
ندوانے دبتہ رہ گئے نکس گئے اسوار
گوری سوئے پلنگ پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ پڑی چو دیس

اس بیہودہ بکواس کو کلام خسرو قرار دے کر اس کی اشاعت کی مصلحت تو شیرانی صاحب جانتے ہوں گے۔ میں تو صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ محترم پروفیسر سراج الدین آذر کی مملوکہ بیاض کے کاتب کو ہندی زبان سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ یہاں تک کہ وہ موزوں طبعی سے محروم ہو ایسے جاہل موضوع کاتب کی تحریر پر ہم کلام خسرو میں اضافے کا اہم اقدام نہیں کر سکتے۔ ان خرافات میں صرف آخری دوہا خسرو کا ہو جو ان کے ہر ہندی کلام کے مجموعے میں موجود ہو۔ لیکن کاتب نے اسے بھی ناقص اور ناموزوں بنا دیا ہو۔

ذیل میں ایک اور خسرو سے منسوب نام نہاد غزل "پنجاب میں اردو" سے نقل کی جاتی ہو

غزل

جب یار دیکھا نین بھر دل کی گئی چنتا اتر
ایسا نہیں کوئی عجب راکھے اسے سمجھائے کر
جب آنکھ سے اوجھل بھیا تڑپن لگا میرا جیا
حقا الٰہی کیا کیا آنسو چلے بھر لائے کر
توں تو ہمارا یار ہے تجھ پر ہمارا پیار ہے
تجھ دوستی بسیار ہے اک شب ملو تم آئے کر
جاناں طلب تیری کروں دیگر طلب کس کی کروں

تیری جو چنتا دل دھرو | اک دن ملو تم آئے کر
بیرا جو من تم نے لیا | تم نے اٹھا غم کو دیا
غم نے مجھے ایسا کیا | جیسا پتنگا آگ پر
خسرو کہے باتاں غضب | دل میں نہ لاوے کچھ عجب
قدرت خدا کی یو عجب | جب جیو دیا گل لائے کر

یہ غزل بھی شیرانی مرحوم نے پروفیسر سراج الدین آذر کی کسی ایسی بیاض سے نقل کی ہے جس کا زمانہ کتابت ان کے بیان کے مطابق تیرھویں صدی ہجری کے ابتدائی سال ہیں۔ یہاں بھی کاتب بیاض زبان سے اتنا نابلد ہو کر کسی پرانے دکنی شاعر کی غلط سلط تک بندی کو امیر خسرو کی غزل بتا رہا ہو۔ "جب یار دیکھا نین بھر" "ایسا نہیں کوئی عجب"۔ "اوجھل بھیا لائے کر۔ حقا الٰہی کیا کیا۔ باتاں غضب۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب دکنی بولی کے ٹکڑے ہیں جو کم وبیش آج تک دکنی مسلمانوں کے گھروں میں زباں زد ہیں۔ یہ غزل قطعاً امیر خسرو کی نہیں ہو سکتی۔

ذیل کا قطعہ بھی "پنجاب میں اردو" میں شیرانی صاحب نے بحوالہ فرہنگ آصفیہ امیر خسرو کا بتایا ہوے

قطعہ

ہندو بچہ ہیں کہ عجب حسن دھرے چھے
بر وقت سخن گفتن[2] مکھ پھول جھڑے چھے
گفتم ز لب لعل تو یک بوسہ بگیرم
گفتہ کہ "ارے رام تمرک کائے کرے چھے"

---

[1] غالباً فیصلہ قیاسی ہو۔ [2] مصرع موزوں نہیں ہو۔

فرہنگ آصفیہ کے دیباچے میں اس قطعے کو خسرو سے منسوب تو کیا ہے لیکن اس کے ماخذ کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ قطعے میں "چھپے" "گجراتی اور" "کاہیں" "دکائے" مرا کھٹی اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ یہ دکن میں بسے ہوئے کسی ادنیٰ درجے کے شاعر کا کلام ہے۔ جس نے اپنا ایک گندہ تجربہ نظم کیا ہے۔ یہ قطعہ امیر خسرو کا کبھی نہیں ہو سکتا۔

اردوئے قدیم میں شمس اللہ قادری نے حسب ذیل غزل امیر خسرو کی بتائی ہے۔ لیکن ماخذ کا پتہ نہیں دیا ہے:—

غزل

خوار شدم۔ ذار شدم لٹ گیا
درغم ہجر تو کمر ٹوٹہ ہے
یار نہیں دیکھتا ہے سوئے من
بے گنہ ہم ساتھ عجب روٹہ ہے
روئے تو رد نو شکن آفتاب
سرو بہ پیش قدِ تو بوٹہ ہے
گاہ ز خسرو تو نہ گفتہ کہ بیٹھ
دہ چہ کند بھاگ مرا پھوٹہ ہے

یہ غزل کاہے کو مسخرہ پن ہے۔ امیر خسرو اہلِ زبان تھے وہ "کمر ٹوٹہ ہے"۔ "ہم ساتھ عجب روٹہ ہے وغیرہ کاہے کو کہتے۔ تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ یہی غزل عہد ہمایوں کے ایک شاعر جمائی سے منسوب ہے جو غالباً ہندوستانی زبان کی شاعری کے دعویدار ..... ہوں گے۔ جمائی کا مقطع یوں ہے +

گاہ نہ گفتہ کہ جمائی تو بیٹھ
ٹھم کردہ کیا اپنا کرم پھوٹا ہے

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے اپنی کتاب "امیر خسرو اور ان کی ہندی شاعری" میں ماخذ کا حوالہ دیے بغیر حسب ذیل دوہا امیر خسرو کا بتایا ہو

شیام سیت گوری لے جنت بھی اینت
ایک پل میں پھر جات ہیں جوگی کاکے میت

یہ دوہا امیر خسرو کا نہیں ہو سکتا اس کا پہلا مصرع بے معنی اور دوسرے مصرعے سے بے تعلق ہو۔ نیز مصرعۂ اولی کی زبان خسرو کی زبان سے مختلف ہو۔

علی گڑھ تاریخ ادب اردو حصّہ اول کے مقدمے میں ڈاکٹر مسعود حسین نے خسرو کی ہندی شاعری کا پہلا مستند ماخذ وجہی[1] دکنی کا "سب رس" مصنّفہ ۱۰۴۵ھ قرار دیا ہو جس میں خسرو کا حسب ذیل دوہا نقل ہوا ہے

پنکھا ہو کر میں ڈلی ساتی تیرا چاؤ
مجھ جلتے جنم گیا تیرے لیکھن باؤ

یہ حقیقت ہے کہ وجہی سب سے پرانا مصنّف ہے جس نے خسرو کا ایک ہندی دوہا پیش کیا ہے لیکن اس کا پیش کیا ہوا دوہا بالکل بے معنی ہے۔ نیز اس کا انداز کلام اور طرز خیال خسرو کے بیان و فکر سے زیادہ دکن کے بیان و فکر سے قریب ہے۔ اس دوہے کو خسرو کے رائج ہندی کلام میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ میں بھی اسے خسرو سے منسوب کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔

خسرو کی مادری زبان خسرو نے اپنی تصنیفات نظم و نثر میں اپنی مادری زبان کو

---

[1] وجہی اردو کا نہایت قدیم ادیب اور شاعر ہے کہا جاتا ہو کہ وہ گول کنڈہ میں عہد ابراہیم قطب شاہ (۹۵۰ھ سے ۹۸۰ھ) تک میں موجود تھا۔ ۱۰۴۵ھ میں اس نے "سب رس" لکھی جو دکنی اردو کی بے حد قدیم نثر کا نمونہ ہے۔

ہندوی کہا ہے۔ لیکن "مثنوی نُہ سپہر" میں انھوں نے اپنے عہد کی ہندوستانی زبانوں کی فہرست ان الفاظ میں پیش کی ہے ؎

[1] سندھی[1] و لاہوری[2] و کشمیر[3] و کبر[4]
(ڈوگری)
دھور سمندری[5]، تلنگی[6] و گجر[7]
(گجراتی)
معبری[8] و گوری[9] و بنگال[10] واودھ[11]
(گھاٹی) (اودھی)
دہلی و پیرامنش[12] - اندر ہمہ حد
ایں ہمہ ہندویست زایام کہن
عامہ بہ کارست بہ ہر گونہ سخن

یہاں خسرو نے ہندوستان کی بارہ[12] زبانوں کا ذکر کیا ہے اور ان سب کو ہندوی بتایا ہے اس تفصیل کے بعد خسرو کی مادری زبان کو دہلوی ہندوی کہنا چاہیئے۔ جو فہرست مندرجہ بالا کی بارھویں[12] زبان ہے اور جس کو خسرو دہلی اور پیرامن دہلی کی زبان بتاتے ہیں۔

یہ ہندوی وہی کھڑی بولی ہے جو اُس وقت خاص طور پر دہلی کے سلمان اور عام طور پر دہلی والے بولتے تھے۔ مسعود سعد سلمان کو (جو خسرو سے تقریباً سوا سو سال قبل

---

[1] مثنوی نہ سپہر مرتبہ ڈاکٹر وحید مرزا میں یہ شعر یوں چھپے ہیں ؎

سندی و لاہوری و کشمیری و کبر ؎ دھور سمندری تلنگی و گجر
معبری و گوری و بنگال و اود ؎ دہلی و پیرامنش، اندر ہمہ حد
ایں ہمہ ہندویست زایام کہن ؎ عامہ بہ کارست بہ ہر گونہ سخن

ہوئے ہیں، خسرو ہندوی کا صاحب دیوان شاعر بتاتے ہیں۔ مسعود کا مولد لاہور ہے اور اغلب یہی ہو کہ ان کا دیوان لاہوری ہندوی میں ہوگا جو مندرجہ بالا فہرست کی دوسری زبان ہے اور دہلوی ہندوی سے مختلف ہے۔ لاہوری ہندوی پر پنجابی ہونے کا بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔

یہ بات تو قطعی اور یقینی ہو کہ خسرو جس زبان کو دہلوی ہندوی کہتے ہیں، وہ وہی کھڑی بولی ہو جس کو آج اردو، ہندی یا ہندوستانی کہا جاتا ہو۔ عہد خسرو میں یہ زبان خطِ نسخ میں تحریر ہوتی تھی۔ خط نستعلیق عہد شاہجہاں سے عام ہوا۔ ناگری رسم خط میں تحریر ہونے والی عوامی بولیوں کو برج بھاشا کی رعایت سے بھاکھا کہا گیا ہو۔ آگے چل کر بھاکھا کا لفظ برج، اودھی، راجستھانی اور شمالی ہند کی ساری عوامی بولیوں پر منطبق ہونے لگا۔

خسرو کے مختصر ہندوی باقیات عام طور پر دہلوی ہندوی میں ہیں۔ لیکن ان میں گیت اور دوہے بھاکھا میں بھی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی مکتبی کتاب "خالق باری" میں بھی جا بجا بھاکھا کے فقرے آئے ہیں۔ حالانکہ کتاب کی اصل عبارت فارسی ہو اور مقصد کتاب دہلوی ہندوی کے لغت کی تعلیم نیز ہندوی لفظوں کو فارسی الفاظ کے مقابل رکھ کر ان کے معیاری معنی کا تعین ہے۔ اس وقت تک ملک کی کسی ہندوی زبان کا کوئی لغت تصنیف نہیں ہوا تھا۔ یہاں تک کہ فارسی کا ہندوستانی لغتِ اول "فرہنگ نامہ قواس" بھی وجود میں نہیں آیا تھا۔

خالق باری میں بھاکھا فقرے لانے سے خسرو کا مقصد شاید یہ ہو کہ جو بچے اپنے گھر میں بھاکھا بولتے ہیں ان کے ذہن و دماغ بھی اس کتاب کے ساتھ آجائیں۔ ــــ خالق باری میں بھاکھا کا ماضی مطلق دیکھیے۔

"خاک دھول" جو باؤ اڑائی"[1] (خاک دھول جو ہوا میں اڑی)۔
صیغۂ تانیث میں ماضی مطلق کی یہی شکل کبیر کی اودھی میں بھی ہے ؎

نلنی تو کا ہے کمھلانی
تیرے مانسر دوریانی

خود خسرو ماضی مطلق کی یہی صورت ایک پہیلی میں کہتے ہیں ؎

ایک ناریپا کو بھاتی
تن واکو سگرا جوں پانی

خالق باری میں صیغۂ تذکیر میں بھا کھا کا ماضی مطلق دیکھیے ع

ترا بہ گفتم " میں تجھ کہیا"[2]

یہی ماضی مطلق کبیر کے یہاں موجود ہے۔ ؎

دوڑت دوڑت دوڑیا جب تک من کی دوڑ
دوڑ تھکے من تھر بھیا دستو ٹھور کی ٹھور

خسرو کی دہلوی ہندوی میں ماضی مطلق کی شکل جو آج بھی رائج ہے خسرو کہتے ہیں ؎

بالا تھا تب سب کو بھایا
بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا

---

[1] شیرانی مرحوم نے اس مصرعے کا ترجمہ "پنجاب میں اردو" کے صفحہ ۱۳۱ پر یہ کیا ہے کہ "خاک دھول جیسے ہوا اڑا سکے"۔ یہ ترجمہ غلط ہے۔ مولوی امین چریا کوٹی نے دیہات نژادی اور دعویٰ سنسکرت دانی کے باوجود "باؤ اڑائی" کا ترجمہ "ہوا چلی" کیا ہے۔ افسوس ہے ہم عوامی زبانوں سے کتنے بے تعلق ہو گئے تھے۔ [2] ماضی مطلق کی یہ صورت ہریانی اور دکنی میں بھی موجود ہے شاید دہلوی ہندی میں بھی رائج ہو۔ کہیا کے آخر میں الف کھڑی بولی کا بھی ہو سکتا ہے۔

دہلوی ہندوی کے ساتھ خسرو کے کلام میں بھاکھا کی بہتات دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہو کہ شمالی ہند کی کئی عوامی بولیاں دہلوی ہندوی کے دوش بدوش دہلی میں موجود تھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے آج بمبئی کی کسی گلی میں "مراٹھی، گجراتی، کچھی اور اردو" ایک ساتھ بولی جاتی ہیں لیکن اس عہد کی دہلی کی مشترک اور مقبول ترین زبان دہلوی ہندوی ہی تھی۔

صدیوں تک ہندوستان کے مختلف حصوں کے عوام کے تغلب اور تصرف کی وجہ سے خسرو کا ہندوی کلام ان کے عہد کی زبان کی بالکل واضح تصویر تو نہیں پیش کر سکتا لیکن پھر بھی ان کے موجودہ ہندوی ذخیرے سے ان کی دہلوی ہندوی کا ایک مبہم خاکا ضرور ہمارے ذہن میں آجاتا ہو۔ اس زبان کا بنیادی ڈھانچہ کھڑی بولی کا ہو جس میں برج بھاشا جزو ثانی کی حیثیت رکھتی ہو۔ پھر اودھی، ہریانی اور پنجابی کا اثر نظر آتا ہو۔ اسکے بعد دارالخلافہ میں آنے والی موجود اور مفقود الوجود بولیوں کے لفظ ملتے ہیں۔ بیرونی زبانوں میں عربی فارسی اور کسی حد تک ترکی دہلوی ہندوی کے معاون ہیں۔ جب خسرو ہندو عورتوں کی زبان میں کچھ کہتے ہیں تو ان کے کلام میں برج بھاشا زیادہ نمایاں ہوجاتی ہو۔ ہوسکتا ہو کہ اس وقت دہلی اور نواح دہلی کی ہندو عورتیں برج بھاشا یا اس سے ملتی جلتی بولی بولتی ہوں اور فارسی سے متاثر کھڑی بولی ہندو گھروں سے باہر بولی جاتی ہو۔ "برج بھاشی دہلی" پرتھوی راج کی شکست کے ساتھ خسرو کی ولادت سے تقریباً ساٹھ سال پہلے ختم ہوئی تھی ایک عروج یافتہ تمدن کی عوامی زبان ساٹھ سال کی قلیل مدت میں محو نہیں ہوسکتی۔

کھڑی بولی خسرو کا عہد شمالی ہند کی لسانی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہو۔ مسلمانوں کے آنے کے بعد دربار دہلی کے چاروں طرف خصوصیت کے ساتھ اور دہلی شہر اور نواح دہلی میں عام طور پر ایک بڑی خوش آہنگ زبان پیدا ہوگئی تھی جس کو آج سے ستر اسّی سال پہلے ہندی محققوں نے کھڑی بولی کا نام دیا ہو۔ اس بولی کی نشانیاں حسب ذیل ہیں:۔

"ا۔ تا۔ کا۔ گا۔ نا۔ اِس۔ اُس۔ جس۔ کس۔ پر۔ میں"

ہندی کے بعض نئے محققوں نے کھڑی بولی کو کرو چھیتر کی زبان بتایا ہو۔ یہ خیال غیر صحت مند بھی ہو اور غلط بھی۔ غیر صحت مند اس لئے کہ ایک علیل ذہن آج کی قومی زبان (کھڑی بولی) کو مسلمانوں کے زیر اثر پیدا شدہ زبان ماننے سے انکار کرنا چاہتا ہو اور غلط اس لیے ہو کہ یہ توجیہ تراشی خلاف حقیقت ہو۔ کرو چھیتر پیرامن دہلی کا علاقہ ہو اور وہاں فارسی میں ڈھلی ہوئی دہلوی کھڑی بولی کا اثر بالکل فطری بات ہو۔

کھڑی بولی کے پہلے شاعر امیر خسرو ہیں۔ دکنی کھڑی بولی کے پہلے نثار خواجہ بندہ نواز ہیں۔ اور شمالی ہند کی کھڑی بولی کے نثار اول اردو کے مستند استاد انشا اللہ خاں انشا ہیں اس کے بعد بھی اس زبان کی سرپرستی بیشتر مسلمان اہل قلم کرتے رہے۔ کھڑی بولی کی پیدائش ہی سے اس کا رسم الخط فارسی تھا۔ پہلے یہ خطِ نسخ میں لکھی جاتی تھی۔ عہد شاہجہاں سے خطِ نستعلیق رائج ہوا اور یہی اس زبان کا رسم الخط بن گیا۔ کھڑی بولی بعض سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ڈیڑھ سو سال قبل سب سے پہلے ناگری رسم الخط میں مرقوم ہوئی اور یہیں سے اس میں سنسکرت کے تت سم (خالص) لفظوں کا دخل شروع ہوا۔ جو روز بہ روز بڑھتا گیا۔

ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہو کہ ہم تاریخی حقائق کو نہ صحت مند نظر سے دیکھ سکتے ہیں نہ متوازن ذہن و دماغ سے سوچ سکتے ہیں۔ ہم یہ بات سمجھنے سے معذور ہیں کہ تاریخ کا فطری رجحان کسی بھی سیاسی یا مذہبی عقیدے سے زیادہ قوی ہوتا ہو۔ تاریخی حقیقت یہ ہو کہ آج سے تقریباً ساڑھے تین ہزار سال پہلے آریہ قوم کی ایک شاخ ویدک زبان بولتی ہوئی ہندوستان میں آئی اور مقامی باشندوں میں خلط ملط ہو کر ڈھائی ہزار سال تک دلکش السنہ اور تمدنوں کو پیدا کرتی رہی۔ ٹھیک اسی طرح تقریباً ایک ہزار سال پہلے آریہ قوم کی ایک دوسری شاخ فارسی زبان بولتی ہوئی ہندوستان میں آئی اور مقامی باشندوں میں خلط ملط ہو کر ایک دلکش زبان اور تمدن کی خالق بنی۔ ان دونوں آریائی شاخوں کو مذہب یا سیاست کچھ بھی نام دے لیکن دراصل یہ دونوں واقعے ہماری قومی زندگی کی تاریخی حقیقتیں

ہیں جن کو بدلنے کی کوشش بہ ہمہ حیثیت ناکام ہوگی۔

بھاکھا یعنی عوامی زبانوں میں بھی بیشتر مسلمان شاعر ہیں۔ خود ہندو زاویے سے ادھیاتمک (روحانی) شاعری کے ابتدا کبیر نے کی اور سنت شاعروں کے لیے راستہ صاف کیا۔ قطبن اور جائسی نے اودھی میں داستانی شاعری کا آغاز کر کے ہندوستان کے عظیم شعری کارنامے تلسی کرت راماین کا میدان تیار کیا۔ یہ بات مسلمانوں کی عظمت کے ثبوت کے لیے نہیں لکھی گئی بلکہ یہ دکھانے کے لیے لکھی گئی ہے کہ مسلمان بھی بہر حال ہندوستانی معاشرے کا ایک جزو لازم ہیں۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم اور ان کے ہم خیال لوگ کھڑی بولی کے نام سے چڑھتے ہیں۔ وہ کھڑی بولی کا ترجمہ اکھڑ بولی کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک علیل اور پست تخیل ہے اس زبان کو کھڑی بولی کہنے والے بعض خصوصیتوں کی بنا پر اسے کھڑی بولی کہتے ہیں ورنہ وہ لوگ بھی اسی کھڑی بولی کو اپنی قومی زبان مانتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مولوی عبدالحق مرحوم اور ان کے گروہ نے آج کے ایشیا کی سب سے حسین زبان کو فرقہ پرستی کے کیچڑ میں لتھاڑ دیا۔

کھڑی بولی مسلمانوں کے ہندوستان آنے کے بعد ایک مخلوط زبان کی حیثیت سے فارسی کے زیر اثر پیدا ہوئی ہے۔ جس کا لہجہ ناگری میں مرقوم ہونے والی پڑی بولیوں سے مختلف ہے۔ اس اہم حقیقت کو ایک نئے زاویے سے پیش کیا جاتا ہے جس سے اس بات کا اندازہ ہوگا کہ کھڑی بولی میں صرف فارسی الفاظ ہی نہیں آئے ہیں اس بولی کا لہجہ بھی فارسی لہجے میں ڈھلا ہے

ناگری رسم الخط کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ہر حرف بالاصل متحرک ہے اور اس میں فتحہ کی آواز مدغم ہے۔ مثلاً ناگری क ہمیشہ (کَ Ka) اور ख ہمیشہ (کھَ Kha) کی آواز دے گا۔ یہی حالت سارے ناگری حروف کی رہے گی۔ ناگری میں مرقوم राम کو (رامَ Raama) राग کو (راگَ Raaga) भग کو دیکھیے (Bhaga) پڑھا جائیگا۔

ناگری حروف ساکن تب ہی ہوتے ہیں جب یا تو وہ نصف ہو کر لفظ میں آئیں

جیسے मार्ग (مارگ Maarga) میں ہے - یا پھر جب ایک مخصوص علامت ہلنت (्) حرف کے نیچے لگائی جائے جیسے क्रम کرم (Kram -) میں म کے نیچے ہلنت کی علامت لگی ہو۔

ناگری حروف کی خصوصیت تحریک کی بنا پر اس رسم الخط میں مرقوم ہونے والے ہر لفظ کا حرف آخر بلکہ لفظ کے ہر ٹکڑے کا حرف آخر متحرک ہوگا۔ جیسے ناگری میں مرقوم अमरनाथ کو (ا م ر نا تھ A ma ra na atha) اور तकलीफ (تکلیف) کو (ت ک لی ف - Ta Ka lee fa) پڑھا جائے گا۔ ظاہر ہے یہ لہجہ نہ کھڑی بولی کا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

کھڑی بولی فارسی لہجے میں ڈھلی ہے جس میں ہر لفظ کا حرفِ آخر بلکہ زیادہ تر لفظ کے ہر ٹکڑے کا حرف آخر بھی ساکن ہوتا ہے۔ جیسے ہم (Ham) تم (Tum) خِدْ مَتْ (Khid mat) خاور (Khaawar) تدبیر (Tad beer) گیت (Geet) وغیرہ۔

فارسی لہجے میں ہندی اور فارسی الفاظ سب سکون حرفِ آخر کے ساتھ بولے جاتے ہیں اور یہی لہجہ کھڑی بولی کا ہے۔ مزید توضیح کے لئے ذیل کا ہندی جملہ شائقین کھڑی بولی کے لہجے میں دیکھئے۔

ناتھ آپ کی جے جے کار رہتی ہے۔

یہ جملہ ناگری میں اس طرح لکھا جائے گا۔

नाथ आप की जय जयकार रहता है

مذکورہ فارسی لہجے کی تربیت سے محروم آدمی اس ناگری جملے کو یوں پڑھے گا۔

Naa Tha - Aa pa - Kee - ga. ya - gaya
Kaa ra - Ra ha tee - Hai -

فارسی تربیت سے محروم جن حلقوں میں کھڑی بولی ناگری رسم الخط کا جامہ پہن کر پہنچی ہے۔ وہاں اس کا لہجہ انتہائی مضحک ہو گیا ہے۔ مثلاً جنوبی ہند کے تامل تلنگو۔ ملایالم اور کنیری حلقوں میں تو کھڑی بولی کے الفاظ کا حرف آخر اشباع کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ وہاں کے لوگ امرناتھ (अमरनाथ) کو A-ma ra Naathaa (امرناتھا)۔ راماین (रामायण) کو Raa maa ya naa (رامایانا) اور بھیم (भीम) کو Bhee maa (بھیما) پڑھینگے۔

انگریزی تحریروں میں Raama اور Raavana Arjuna میں حرف آخر کی تحریک ناگری ہی سے منتقل ہو کر گئی ہے۔

اس وقت اس مختصر بحث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ناگری تحریر کے بنیادی نقائص کو سامنے لایا جائے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ کھڑی بولی فارسی کے زیر اثر پیدا ہوئی اور اس کا لہجہ ناگری میں مرقوم نہ ہونے والی زبانوں سے مختلف ہے۔ کھڑی بولی کو قومی زبان تسلیم کرنے کے بعد فارسی لہجے کی تربیت بھی بے حد ضروری ہے۔ جس کا واحد ذریعہ اردو ہے جو دہلی اور لکھنؤ میں منجھ کر بحد کمال شفاف ہو چکی ہے۔

ترکی اور فارسی بولنے والے جن راستوں سے ہندوستان میں آئے ہیں ان کی ہر منزل کھڑی بولی کے ارتقا کی ایک سیڑھی ہے۔ خیال ہے کہ کھڑی بولی لاہور سے واضح امتیازی شکل اختیار کرنے لگی تھی جو دہلی آکر ایک باضابطہ زبان بن گئی۔

اس کھڑی بولی میں دہلی کی راجدھانی میں آنے والی بیسیوں بولیوں کی دھاریں تت سم (خالص)، اور تدبھو (خود رد) لفظوں کے ساتھ مل رہی تھیں برج بھاشی اور پوربی وغیرہ دہلی کی اس زبان کو قطعاً دوغلی زبان سمجھتے ہوں گے۔ لیکن نئی نئی زبانوں کے سوتے اس نوزائیدہ زبان کو بے پناہ قوت دے رہے تھے، اور یہ ہندوستان کی ہر زبان سے زیادہ ترقی کر رہی تھی۔ اس زبان کی ترقی کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ یہ

ہونے تاریخی حقائق کا فطری تقاضا تھی اور حکومت کی مدد کے بغیر از خود پھبک رہی تھی۔ اس زبان کو دہلوی بولی کہا گیا۔ دیہات والے اسے ترکوں کی بولی کہتے تھے۔ اسوقت ترک کے معنی تھے مسلمان جیسا کہ کبیر نے کہا ہو:۔

ہندن کی ہندوائی دیکھی ترکن کی ترکائی

یا

اک نرجن اللہ میرا
ہندو ترک دو نہیں میرا

اس زبان کو آج سے سیکڑوں سال پہلے زبان ہندوستان[1] بھی کہا گیا ہو۔ گویا اس کے لئے اس ملک کی مشترکہ زبان ہونے کا فیصلہ صدیوں قبل ہو چکا تھا۔ خسرو اسی زبان کو دہلوی ہندوی کہتے ہیں۔

خسرو اور تہذیب بیان خسرو کو امیر کا خطاب چالیس پینتالیس برس کے سن میں جلال الدین خلجی کے دربار سے ملا۔ لیکن حقیقت یہ ہو کہ وہ پیدائشی امیر تھے۔ ان کی پرورش مہذب ترین ماحول میں ہوئی اور ان کی زبان دہلی کی شائستہ ترین زبان تھی۔ اس کے ساتھ ان کے اعلیٰ ذوق اور ان کی حیرت ناک صلاحیت کا لحاظ بھی ضروری ہو۔ ان خصوصیات کے پیش نظر خسرو کی ہندوی میں غیر معمولی تہذیب بیان کوئی خلاف توقع بات نہیں۔ لیکن ان کی ہندوی کے مخالفین اس تہذیب بیان کو اپنے منفی استدلال کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہو کہ آج سے چھ سات سو سال قبل زبان میں اتنی صفائی ناممکن ہو۔ سنسکرت، پراکرت اور پالی وغیرہ کے بعد شمالی ہند کی عوامی زبانوں میں اپ بھرنش کا کچھ باضابطہ منظوم ادب جین بھکشوؤں، اور بعض دوسرے شاعروں کے نمونوں

---

[1] وجہی نے "سب رس" میں (۱۰۴۵ھ) اس زبان کو "زبان ہندوستان" کہا ہو۔

اور چھندوں کی صورت میں ملا ہو۔ جس کے بعض اجزا لگ بھگ ہزار برس پرانے بتائے جاتے ہیں۔ میرے خیال میں اس ادب کے باقی رہنے کا سبب سخت ضابطے اور قانون میں جکڑی ہوئی جین خانقاہیں اور جین مندر رہیں۔ عوام نے اس کام میں قطعاً کوئی حصہ نہیں لیا۔

اپ بھرنش کے بعد شمالی ہند میں بھاکھا کی مختلف عوامی بولیوں کا دور شروع ہوا جن کے قدیم نمونے بعض ٹوٹے پھوٹے لوک گیتوں کی صورت میں کہیں کہیں مل جاتے ہیں یا پھر پرانی سادھوؤں کی بولی کے کچھ فقرے، پرانے مٹھوں سے حاصل کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ سب مواد دہلوی ہندوی کے موضوع کو کوئی مدد نہیں دے سکتا۔

کچھ سال پہلے تک ہندی کی سب سے قدیم نظم "پرتھی راج راسا" سمجھی جاتی تھی۔ جو دہلی کے دلیجہ پرتھی راج چوہان کے جنگ نامے کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس نظم کے لئے کہا جاتا تھا کہ اسے خسرو سے پچاس ساٹھ سال پہلے پرتھی راج کی شکست کے وقت اس کے دربار کے شاعر چند بردائی نے تصنیف کیا ہو۔

یہ نظم ایک اتنا بڑا کذب و فریب تھی کہ اس نے ادب سے لیکر تاریخ تک کو متاثر کیا حقیقت یہ ہو کہ اس نظم کا دہلی کی زبان سے کوئی تعلق نہیں۔ معلوم یہ ہوتا ہو کہ کسی بھاٹ نے سولھویں یا سترھویں صدی عیسوی میں یہ نظم کہہ کر کسی راج پوت راجہ کو فریب دیا ہو اس نظم میں کئی جگہ آتشیں اسلحہ کا ذکر ہو۔ جس کا خواب بھی پرتھی راج کے عہد میں نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ شمالی ہند میں آتشیں اسلحہ غالباً سب سے پہلے بابر کے ساتھ آئے ہیں۔

اس کے علاوہ اس نظم میں فارسی اور عربی الفاظ (بہ اندازہ محمود شیرانی مرحوم) دس فیصدی موجود ہیں۔ یہ صورت عہد اکبر و جہانگیر کے بعد ہی راجستھانی زبان میں پیدا ہو سکتی تھی۔ جب مغل اور راج پوت تعلقات کے ساتھ فارسی اور عربی بھی راج پوتوں میں پہنچ چکی تھی۔

خسرو کی دہلوی ہندوی پر جس مواد سے روشنی پڑسکتی ہو۔ وہ بے حد مختصر ہو۔

ذیل میں ہم اسی مواد کا جائزہ لیتے ہیں۔

سب سے پہلے خسرو کے دادا پیر (یعنی خواجہ نظام الدین اولیا کے پیر) شیخ فرید الدین گنج شکر متوفی ۶۶۲ھ مرید بختیار کاکی دہلوی کے چند ہندوی فقرے، ان کی ایک نیم فارسی و نیم ہندوی نظم اور ان کے دو ہندوی شعر ملاحظہ ہوں:۔

شیخ نے اپنے کم سن یتیم مرید زادے برہان الدین(۱) کو اپنی بیعت میں لے لیا۔ اس پر برہان الدین کی والدہ عرض کرتی ہیں:۔

والدہ:۔ خوجا۔ برہان الدین بالا دبچہ ہے

شیخ:۔ مادر سوناں۔ پونو کا چاند بالا دبچا ہوتا ہے

اسی طرح شیخ گنج شکر آشوب چشم کی وجہ سے آنکھ پر پٹی باندھے اپنے مرشد بختیار کاکی کو وضو کرا رہے تھے۔ بختیار کاکی کی نظر شیخ کے چہرے پر گئی اور فرمایا:۔

بختیار(لے):۔ بابا۔ آنکھ پر پٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟

شیخ:۔ آنکھ آئی ہے۔

بختیار:۔ اگر آئی ہے۔ ایں را بستہ چہ آید۔

شیخ فرید الدین گنج شکر کی ایک نظم دیکھئے:۔

وقتِ سحر وقتِ مناجات ہے
خیز در آں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا کہ بہ گوید ترا
خسپ، چہ خیزی کہ ابھی رات ہے

لے یہ پہلا ہندوی فقرہ بختیار کاکی دہلوی کا ہے جو گنج شکر کے بھی بزرگ ہیں۔ یعنی خسرو کے دادا مرشد کے مرشد۔

بادمِ خود ہمدم (و) ہشیار باش
صحبتِ اغیار بوری (بری) بات ہے
باتنِ تنہا چہ روی زیں زمین
نیک عمل کن کہ وہی سات ہے
پند شکر گنج دل و جاں شنو
ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

گنج شکر کا ایک شعر:۔

عشق (عاشقی) کار موز نیارا ہے
جز مرد پیر کی نہ چارا ہے

یہ شعر بھی ہے

آشا کیری [illegible] یہی سوریت
جاؤں ناۓ کہ جاؤں میت۔ [1]

شیخ گنج شکر کے ارتحال کے وقت خسروؔ ۱۳ سال کے تھے۔ لہٰذا مندرجہ الانفردوں اور اشعار کی زبان عہدِ خسروؔ سے مقدم تر عہد کی زبان سمجھی جاۓ گی۔ لیکن پھر بھی گنج شکر اور خسروؔ کی زبان میں کوئی خاص فرق نہیں۔ جب گنج شکر کی زبان اتنی صاف ہو سکتی ہو تو پھر طوطیٔ ہند کی زمزمہ سنجی پر شبہہ کیسا؟

۲۔ خسروؔ کے ہم عہد شاعر بوعلی شاہ قلندر کا حسب ذیل دوہا مشہور ہے

---

[1] ماخوذ از:۔
Life and time of Saikh Fariduddin Gaiy-e-Shakar
Prof: Khaliq Ahmad Nizami

سجن سکارے جائیں گے نین مریں گے روئے

بدھنا ایسی رین کر بھور کدی نا ہوئے

پہلے مصرعے میں "گے" کی موجودگی سے اس دوہے کی زبان پر کھڑی بولی کا گمان ہوتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بیشتر پرانے مسلمان شاعروں کی بھاکھا میں کھڑی بولی کی جھلک آجاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس وقت تک قواعد زبان واضح طور پر مدون نہیں ہوئے تھے اور مسلمان بھاکھا کے اشعار میں جابجا اپنی کھڑی بولی کھپا دیتے تھے۔ لیکن یہ صورت پرانے عہد کے شاعروں تک رہی۔ آگے چل کر تو اودھی نے جائسی اور برج نے خان خاناں اور رس کھان ایسے مسلمان شاعر پیدا کئے جن کی زبان کا معیار اودھی اور برج کے کسی شاعر سے کم نہیں۔

بہرحال مندرجہ بالا دوہے کو میرے خیال میں بھاکھا ہی کہنا مناسب ہوگا۔

۳- ایک کتاب خیر المجالس خسرو کے پیر بھائی شیخ نصیر الدین محمود المعروف بہ چراغ دہلوی (۶۷۵ھ سے ۷۵۷ھ تک) کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے سلسلہ چشتیہ کے ایک بزرگ حمید قلندر نے مرتب کیا اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ تاریخ نے بڑے اہتمام سے پروفیسر خلیق احمد نظامی لکچرار شعبہ تاریخ کے انگریزی مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ ملفوظات کی اصل عبارت فارسی ہے۔ لیکن اس میں چند ہندی فقرے بھی آگئے ہیں جو کافی غور طلب ہیں۔

لے۔ برج بھاشی یا اودھی بھاشی مسلمان اب بھی جو زبان بولتے ہیں اس میں کھڑی بولی کا رنگ موجود ہوتا ہے۔ مثلاً ایک اودھی بھاشی مسلمان بولے گا:-

"ہم آر ہا" (ہم آئیں گے)۔

یہی فقرہ ایک اودھی بھاشی ہندو اس طرح بولے گا:-

"ہم آئب" وغیرہ۔

چراغ عرف عام میں دہلوی ہیں۔ خسرو کے ہم عہد ہیں۔ اور ان کے پیر بھائی بھی ہیں اوپر کی مثالوں سے یہ واضح ہو کہ خسرو کی زبان بختیار کاکی، گنج شکر اور بو علی شاہ قلندر سے تو میل کھاتی ہو لیکن اس قدر ذاتی قربت کے باوجود خسرو اور چراغ کی زبان میں بعد المشرقین ہو۔ ایک شائستہ دہلوی ہندوی ہو تو دوسری اکھڑ ہریانی جسے اجاب باگڑ و بولی بھی کہا گیا ہو۔ خیر المجالس کے ہندوی فقرات دیکھئے:۔

علی مولا بدایونی مولینا علاؤ الدین کے سامنے ہونہار نوجوان خواجہ نظام الدین کے لئے پیشین گوئی کر رہے ہیں۔ علی مولا چوں دید۔ آغاز کرد بزبانِ ہندوی۔ "ارے مولانا یہ بڈا ہوسی" اے مولینا ایں مرد بزرگ خواہد شد۔

مولینا گفت علی از کجا می گوئی۔ گفت من درو دو چیز می بنیم۔ یک آنست کہ در ہندوی گفتند۔ "جو مند اسا بندے سو پائیں پیرے" یعنی او کہ دستار بندد۔ او بر پائے کسے افتد۔

دوسری جگہ خیر المجالس میں مرقوم ہے:۔

فرمودند در عہدِ موسیؑ بت پرستے بود۔ روزے او را تپ آمد۔ سر بر پائے بت نہاد و گفت "تو میرا گسائیں۔ تو میرا کرتار۔ مجھے اس تپ تھیں چھڈا"

ان دونوں عبارتوں میں تین ہندی فقرے ہیں:۔

۱۔ بزبان علی مولا بدایونی:۔ ارے مولینا یہ بڈا ہوسی۔

۲۔ کہاوت:۔ جو منداسا بندے۔ سو پائیں پیرے۔

۳۔ بزبان بت پرست عہد موسیٰؑ:۔ تو میرا گسائیں۔ تو میرا کرتار۔ مجھے اس تپ تھیں چھڈا۔

یہ تینوں فقرے ہریانی[1] کے معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرا فقرہ محاورہ یا کہاوت ہو۔ کماد میں

---

[1] بڈا اور چھڈا تو ہریانی میں ہیں۔ لیکن ہریانے کے بعض ادیبوں نے مجھے بتایا کہ سی معنی گا اور تھیں معنی تے۔ اب بھی ہریانے کے بعض حصوں میں رائج ہیں۔

اکثر قدیم تر لسانی شکل میں رائج رہتی ہیں۔ شاید یہی وجہ ہو کہ ہندوستان میں نووارد فارسی یا ترکی بولنے والوں کے لہجے کے اثر سے مندرجہ کہاوت میں منڈا سا کا "ڈال" دال فارسی بن گیا اور باندھے کا "الف" نیز ہائے مخلوط غائب ہو گئی۔ بہرحال اس کہاوت پر کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی البتہ پہلے اور تیسرے فقرے میں حسب ذیل الفاظ غور طلب ہیں:۔

مڈا بمعنی بڑا = تسی بمعنی تگاد مستقبل)

تھیں بمعنی سے = جھنڈا بمعنی جھرٹا

"ڈال" جس وقت پنجاب سے مشرق کی طرف بڑھی تو وہ وسط یا آخر لفظ میں "ڑے" بننے لگی اور دہلی پہنچ کر (سوائے بعض خاص صورتوں کے) "ڈال" واضح طور پر "ڑے" ہو گئی۔ جیسا کہ خسرو نے کہا ہے:۔ ع۔

کھرا بھی لوٹا بڑا بھی لوٹا

یا شکر گنج کہتے ہیں:۔ ع۔

ریش سبلت سے گر بڑے ہوتے[1]

مشرق مزید یعنی اودھی کے علاقہ میں پہنچ کر مذکورہ "ڈال" واضح تر "ڑے" ہو گئی۔ دہلی اور اور پورب میں "ڈال" لفظ کے وسط یا آخر میں حسب ذیل صورتوں میں آتی ہے:۔

(۱) اگر ڈال سے قبل نون موجود ہو جیسے ہانڈی۔ منڈی۔ سانڈ وغیرہ۔

تلسی داس کی معیاری اودھی میں راماین کا یہ مصرعہ دیکھئے:۔ ع۔

ڈنڈ پر چنڈ منڈ بن دھادیں

پورب والے اکثر نونِ غنہ کے ہوتے ہوئے بھی "ڈال" کو "ڑے" کر دیتے ہیں جیسے:۔ بھانڑ

---

[1] گنج شکر بختیار کاکی کے مرید ہیں۔ جن کا قیام دہلی میں تھا۔

Life time of Shekh Fariddin Gunj-e-Shakar.

سے بھانڑ۔ چھانڈ سے پھانڑ۔ ڈانڈ سے ڈانڑ۔

(ب) لفظ کے درمیان "ڈال" کے باقی رہنے کی شکل یہ ہو کہ ڈال مشدد ہو جیسے :-
ہڈّی۔ ٹڈّی۔

بہر حال عہد خسرو کی دہلوی ہندوی۔ برج بھاشا اور اودھی میں بڑا اور چھوٹا کا وجود ناممکن ہو جس کے ثبوت کے لئے خسرو اور گنج شکر کی سندیں کافی ہیں۔
اسی طرح "سی" بمعنی گا (مستقبل) دکنی، ملتانی اور بہ قولے ہریانی میں ہو۔ لیکن دہلوی ہندوی میں "گا" آج ہی کی طرح مستعمل تھا۔ جیسے خسرو کہتے ہیں: ع

فردا جو کال آوے گا

یا بوعلی شاہ قلندر کہتے ہیں :- ع

سجن سکارے جائیں گے نین مرینگے روئے

دہلوی ہندوی، برج بھاشا اور اودھی میں "تھیں" بمعنی "سے" نہیں ہو۔ "تھیں" دکنی اور بہ قولے ہریانی میں تو موجود ہو۔ لیکن دہلوی ہندوی میں "سے" رائج تھا جیسے خسرو کہتے ہیں: ع

ایک تھال موتی سے بھرا

یا گنج شکر کہتے ہیں :- ع

ریش سبلت سے گڑ بڑے ہوتے

اس توضیح کے بعد اس غلط عقیدے کی تصحیح بھی کر دینا ہو کہ "شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی ہیں" دراصل ان کے مرشد خواجہ نظام الدین ان کو "چراغ دہلی" کہتے تھے اور اسی بنا پر وہ "چراغ دہلوی" مشہور ہو گئے۔ لیکن حقیقت یہ ہو کہ چراغ اودھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳

لے گنج شکر کے یہاں سیتی اور سوں بھی مستعمل ہو۔

برس کی عمر تک وہ اودھ ہی میں رہے۔ اس کے بعد ان کو مرشد کی تلاش ہوئی اور وہ دہلی آ کر خواجہ نظام الدین اولیا کے مرید ہو گئے۔ ان کا قیام دہلی اسی کے بعد شروع ہوا۔ اس معلومات کی روشنی میں خیر المجالس کے مندرجۂ بالا ہندی فقرات پر غور کیا جاتا ہے۔ فارسی عبارت کے درمیان ہندی فقرات عند الضرورت صرف بہ طور نقل قول لائے جاتے ہیں۔

ہندوی کا فقرۂ اول:۔ "ارے مولنا یہ بڈا ہوسی" اگر خود شیخ چراغ نے اپنی طرف سے ہندوی میں لکھا ہے تو اسے ان کی مادری زبان اودھی یا اس وقت کے مسلمانوں کی شائستہ زبان دہلوی ہندوی میں ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن یہ ثابت ہے کہ یہ فقرہ نہ اودھی کا ہے نہ دہلوی ہندوی کا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ یہ فقرہ علی مولا بدایونی کا قول ہے۔ بدایوں برج بھاشا کا حلقہ ہے۔ لہٰذا اسے علی مولا کی مادری زبان برج بھاشا میں ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ بات بھی نہیں ہے۔ جس کے بعد ظاہر ہے کہ نہ تو یہ شیخ چراغ کے الفاظ ہیں اور نہ علی مولا کا قول۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ دوران تصحیف میں غالباً شیخ چراغ کے خیال نے ہریانی کا جامہ پہن لیا ہے۔

ہندوی کا فقرۂ دوم:۔ جو منداس بندے سو پائیں پیرے" یہ ایک کہاوت ہے جس پر گفتگو کی ضرورت نہیں۔

ہندوی کا فقرۂ سوم:۔ "تو میرا اگ ائیں۔ تو میرا کرتار۔ مجھے اس تپ تھیں چھڈا" بت پرست کی رعایت سے عہد موسیٰ کے بت پرست کی زبان سے ہندی بلوانا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ اس بت پرست کو در اصل عبرانی بولنا چاہیئے تھا۔ ورنہ ان ملفوظات کی زبان فارسی ہندی کے مقابلے میں عبرانی سے قریب تر تھی۔

جہاں تک اس فقرے کی زبان کا تعلق ہے۔ میں یہ دلائل سابق یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ فقرہ بھی چراغ کا نہیں۔ تھیں۔ اور چھڈا کا وجود اودھی میں نہیں ہے۔ ان تینوں فقروں کی زبان یکساں ہے اور یہ کسی ایسے آدمی کی تحریر ہے۔ جو ہریانے کا

رہنے والا ہے۔

مرتب کتاب حمید قلندر اس بات پر مصر ہیں کہ یہ ہندی فقرے اسی شکل میں صاحب ملفوظات کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔ شیخ چراغ کا سنہ ارتحال ۷۵۷ھ ہے اور خیر المجالس کا قدیم ترین قلمی نسخہ جو اس وقت باقی ہے[1] ۱۰۶۰ھ کا ہے۔ ممکن ہے تین سو سال کی اس طویل مدت میں یہ غیر معروف صحیفہ تصرفات کی زد میں آگیا ہو۔ بہرحال یہ امر تو یقینی ہے کہ نہ تو یہ ہندی فقرے شیخ چراغ کے ہیں اور نہ انھیں عہد خسرو کی دہلوی ہندی سے کوئی تعلق ہے۔

میں ان محققین سے متفق نہیں جو عہد خسرو کی زبان پر غور کرنے کے لئے ان چھوٹے چھوٹے فقروں کو غیر اہم سمجھتے ہیں۔ البتہ اور ان کے حدود دیر غور و فکر کرنے والوں کے لئے یہ فقرے راہ کے چھوٹے چھوٹے دیئے ہیں۔ جن کی روشنی میں بڑے اہم حقائق تک پہنچا جا سکتا ہے کاش یہ مواد اس سے زیادہ ہوتا۔

خسرو کے ہندی کلام کو پیش نظر رکھ کر میرا خیال ہے کہ خود خسرو کی زبان کا نمونہ ان کے یہ شستہ مصرعے ہیں:- ع

کچھ گرڑھیے۔ سنوایئے پکارا

یا

پھر کچھ نہ گڑھا۔ نہ کچھ سنوارا

اپنی سطح سے اتر کر عام لوگوں سے خسرو جس زبان میں بات کرتے ہوں گے اس کا نمونہ یہ ڈھکوسلا ہے:- ے

کھیر پکائی جتن سے چرخا دیا جلا

کتا آیا کھا گیا۔ تو بیٹھی ڈھول بجا

---

[1] یہ اطلاع اپنے ایک کرمنامے میں مولنا عرشی نے دی ہے

پنگل کی رعایت سے خسرو کے دوہے اس بھاکھا میں ہیں جو ان کی مادری زبان تو نہیں۔ لیکن ان کے چاروں طرف بولی جاتی تھی ع۔

چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چہو دیس

گیتوں میں خسرو کہیں مسلمان دلہن کی زبان میں ملہار گاتے ہیں:- ع

اماں میرے بابا کو بھیجو جی کہ ساون آیا

کہیں ویشنو بھاؤ کے گیتوں میں وہ ہندو عورتوں کی بولی الاپتے ہیں۔ جس کو بھاکھا ہی کہا جائے گا:- ع

چڑیاں پھوروں - پلنگ پر ڈاروں

چیستانوں میں خسرو لڑکوں اور لڑکیوں کی دل پسند زبان تک پہنچ جاتے ہیں۔ جیسے یہ بھٹے کی پہیلی:- ے

آگے آگے بہنا آئی پیچھے پیچھے بھیّا
دانت نکالے بادا آئے برقع اوڑھے میّاں

موضوع کی رعایت سے ان کے یہاں چیستانوں کی زبان بھی بدلتی رہتی ہے۔

خسرو کی مشہور غزل "زحال مسکیں" فارسی اور بھاکھا کی آمیزش کی صنعت میں کہی گئی ہے جو خالص دہلوی ہندوی نہیں ہے۔ مطلع ہی دیکھئے جس میں ٹھیٹھ فارسی اور ٹھیٹھ بھاکھا فقروں کی آمیزش ہے:- ے

ز حال مسکیں مکن تغافل درآئے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں نہ دارم اے دل نہ پی ہو کاہے لگائے چھتیاں

اس صنف کو بعض حضرات نے ریختہ کا نام دیا ہے۔ لیکن تحفۂ چشتیہ (۱۰۶۵ھ) از مخدوم علاؤ الدین برناوی کی شہادت کے مطابق خسرو کے زمانے تک ریختہ کا لفظ صرف

لے میں نے خسرو کی کسی تحریر میں ریختہ کی اصطلاح نہیں دیکھی۔

موسیقی کی اصطلاح تھی۔ جس کے معنی تھے کسی ایک تال اور راگ میں فارسی اور ہندی فقرے کو ترتیب دینا۔

شمالی ہند میں عہدِ خسرو کے بعد کی تین چار صدیاں

شمالی ہندوستان سے سنسکرت کے غائب ہونے کے بعد سے سرکاری زبان فارسی یہاں کے ادبی ذوق پر مسلط ہو گئی۔ عوامی زبانیں حکومت کی سرپرستی سے محروم تھیں۔ اس عہد کی سب سے جاندار زبان دہلوی ہندوی یا کھڑی بولی تھی۔ جو آہستہ آہستہ شہروں کے متمدن معاشرے پر قابض ہو گئی تھی۔ خسرو نے اپنے افکار سے اس زبان کو سجانے کی کوشش کی اور ایک کارِ عظیم کی ابتدا کر گئے۔ لیکن فارسی کے سامنے اس زبان کو ادبی مرتبہ نہ مل سکا۔ یہ حالت خسرو کے بعد سے عہدِ محمد شاہ تک رہی۔

کھڑی بولی کی قسمت اس وقت جاگی جب دکن میں اسلامی حکومت کا عروج ہوا۔ دکنی سلمان بادشاہ خالص ہندوستانی مزاج تھے۔ انھوں نے کھڑی بولی کو ایک ادبی زبان کا درجہ دیا۔ اس زبان میں خود شعر و ادب کی تخلیق کی اور اس کے ادیبوں کو ہر طرح نوازا۔ دکن پہنچ کر کھڑی بولی ریختہ اور دکنی وغیرہ کے نام سے مشہور ہوئی۔

شمالی ہندوستان میں دہلوی ہندوی تو فارسی کے بوجھ کے نیچے دبی رہی۔ لیکن برج، دکھ بھاکھا بولیوں میں عوامی ادب پیدا ہونے لگا۔ بھاکھا کے ان شاعروں میں کبیر، سور اور تلسی ہندوستانی تاریخ کی غیر فانی شخصیتیں ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ کھڑی بولی شمالی ہند میں شائستہ سے شائستہ تر ہوتی جاتی تھی۔ گو خسرو کے بعد کئی سو برس تک یہاں کھڑی بولی کا کوئی قابلِ ذکر شاعر نہیں ہوا۔ لیکن پھر بھی یہاں والے دکنی ریختہ کو اپنی زبان کے مقابلے میں ہیچ اور کم مایہ سمجھتے تھے۔ سعد اللہ گلشن۔ ولی ایسے صاحبِ دیوان استاد کو ان الفاظ میں نصیحت کرتے ہیں:۔

"شما زبانِ دکنی را گزاشتہ۔ ریختہ موافقِ اردوئے شاہجہان آباد موزوں بکنید تا موجب

شہرت و رواج و قبولِ خاطر صاحب طبیعانِ عالی مزاج گردد ۔"

گویا بہ الفاظِ دیگر سعد اللہ گلشن کے نزدیک معیاری زبان " اردوئے شاہجہاں آباد " تھی نہ کہ دکنی ریختہ ۔

خسرو کی تہذیب بیان کے خلاف استدلال کرنے والوں نے ان کی صفائی زبان کا مقابلہ دکن کی ابتدائی گنجلک کھڑی بولی سے کر کے کچھ غلط نتیجے نکالے ہیں۔ حالانکہ ظاہر ہو کہاں خسرو کی زبان اور کہاں دکن کا ریختہ جس کی انتہائی ترقی یافتہ شکل یعنی دکنی کی زبان کو بھی سعد اللہ گلشن معیاری زبان نہیں مانتے ۔

شمالی ہند میں خسرو کے بعد ہندوستانی زبان کے پہلے نمایاں شاعر کبیر ہیں ۔ جو کاشی کے جولاہے تھے ۔ خسرو کی تہذیب بیان کے خلاف دلیل تراشنے کے لئے بعض لوگ خسرو کی زبان کا مقابلہ کبیر کی زبان سے کر کے یہ کہتے ہیں کہ جب کبیر کی زبان میں صفائی نہیں تو ان سے مدتوں قبل خسرو کی زبان میں شائستگی کیونکر ممکن ہو سکی ۔ کبیر یقیناً ہندوستان کے عظیم ترین عوامی شاعر ہیں ۔ اپنی زبان کے لئے وہ کہتے ہیں " بولی ہمری پوربی " (یعنی اودھی) ۔ ان کے کلام میں کھڑی بولی کی پٹ جا بجا اس لئے آگئی ہو کہ وہ ایک مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ۔ لیکن ان کا خاندان مسلم معاشرے کی سب سے نیچی سطح کا تھا ۔ لہٰذا ان کی کھڑی بولی بھی غیر شائستہ تھی ۔ عوامی شاعری میں اس بولی کا رنگ مزا دے جاتا تھا لیکن زبان کے اعتبار سے ان کی کھڑی بولی کا تقابل خسرو کی زبان سے کرنا نہایت غیر معقول بات ہو ۔

ایک سیاح اور صوفی بزرگ شیخ بہار الدین باجن ہوئے ہیں جن کا سنہ وفات ۹۱۲ھ بتایا جاتا ہے۔ یہ ہندی اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ انھوں نے ایک تحریر میں بے ثباتیٔ دنیا پر کہی ہوئی اپنی ایک نظم کی زبان کو دہلوی (دہلوی ہندوی) کہا ہے اس نظم کا پہلا شعر یہ ہے:۔

یہ فتنی[1] کیا کیسے ملتی ہے
جب ملتی ہے تب چھلتی ہے

باجن کی تحریر کو پیش نظر رکھ کر یارانِ طریقت نے ستم یہ کیا ہے کہ اس نظم کو دہلوی ہندوی کا پہلا نمونہ قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ ظاہر ہے باجن کی وفات سے دو سو سال پہلے دہلوی ہندوی کے لاکھوں شعر کہنے والا شاعرِ اعظم خسرو خود دہلی میں موجود تھا۔ اس وقت دہلوی ہندوی کا نمونۂ اوّل خسرو کا کلام ہے۔

باجن دراصل دکن کے رہنے والے ہیں۔ یہ اور ان کے بھائی میاں "میناں" شیخ رحمۃ اللہ گجراتی کے مرید تھے ان کے والد کا مزار مرانکٹھی بھاشی شہر برہان پور میں ہے۔ ہو سکتا ہے یہ بھی وہیں کے رہنے والے ہوں۔

باجن کی زبان دکنی کھڑی بولی ہے۔ لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ دسویں صدی ہجری کے ابتدائے ربع اوّل تک اس کھڑی بولی کے لئے متفقہ طور پر نام وضع نہیں ہوئے تھے۔ کھڑی بولی دہلی سے دکن میں آئی اس لئے شاید اس زمانے میں اسے دہلوی زبان بھی کہا جاتا ہو۔ باجن نے ان ہی معنوں میں اسے دہلوی زبان کہا ہے۔ آج کل بھی دکنی مسلمان اپنے گھروں میں جو زبان بولتے ہیں۔ اسے وہ اردو زبان کہتے ہیں۔

مندرجۂ بالا شعر کا صرف ایک مصرع "یہ فتنی کیا کیسے ملی ہے" سامنے رکھ کر ایک

---

[1] "کیسے" کی یائے ہندی حا قط از تقطیع کر کے اس مصرع کا وزن ہے۔ فعلن چار بار۔

لسانی شعور رکھنے والا یہ فیصلہ کر سکتا ہو کہ یہ وہی کھڑی بولی ہو۔ جو اب تک دکنی مسلمانوں کے گھروں میں رائج ہے۔

فقتی (د تانیث) شمالی ہند کی کھڑی بولی کے شعر و ادب میں شاید کہیں استعمال نہیں ہوا ہے۔ لیکن دکنی مسلمانوں میں آج بھی مستعمل ہو۔

"کیا کیسے ملتی ہو" کے فقرے میں مراٹھی "کونا لا ملتے کائے" کا انداز پوری طرح موجود ہو۔ شمالی ہند والے ایسے موقع پر "کیا" کی جگہ "کب" کہیں گے "کب کیسے ملتی ہو"

بہر حال باجن کی نظم دکنی میں ہو۔ دہلوی ہندوی سے اسے کوئی سروکار نہیں۔

جھنجھانہ ضلع مظفر نگر (مغربی یوپی) کے رہنے والے ایک شاعر محمد افضل عہد محمد شاہ سے قبل اور خسرو سے تین سو سال کے اندر ہوئے ہیں جن کا سنہ ارتحال سنہ ۱۰۲ھ سے قبل یا سنہ ۱۰۳ھ بتایا گیا ہو۔ ان کی ایک نظم "بکٹ کہانی" یا "بارہ ماسہ" کھڑی بولی میں ملتی ہو۔ جھنجھانہ ضلع مظفر نگر کی رعایت سے اس نظم کو دہلوی ہندوی کا نمونہ قرار دیا گیا ہو۔ حالانکہ حقیقت یہ ہو کہ افضل کی یہ نظم دکنی زبان میں ہو۔

اس نظم کو دیکھ کر یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ شمالی ہند کے شاعر نے دکنی میں نظم کیوں کہی لیکن اسپرنگر اور قائم کے بیان سے یہ معمہ حل ہو گیا۔ قائم کے حوالے سے اسپرنگر نے لکھا ہو کہ "افضل عہدِ قطب شاہ (جو سنہ ۱۰۲۰ھ میں تخت نشین ہوا) سے پیشتر گزرا ہو۔ اس کی تعلیم معمولی تھی صوفیانہ شعر کہتا تھا۔ اس نے ایک بکٹ کہانی لکھی ہو جس کا نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانے میں محفوظ ہو۔" دکنی زبان میں افضل کا کلام ہونے کے ساتھ ان کے عہد کا تعین ایک دکنی بادشاہ کی تخت نشینی کے زمانے سے کیا گیا ہو۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہو کہ افضل کا مولد جھنجھانہ ضلع مظفر نگر

ہوگا۔ لیکن ان کا مسکن دکن ہی تھا۔ اگر وہ شمالی ہند میں رہتے ہوتے تو شمالی ہند کا ایک تذکرہ نویس قائم ان کا ذکر شمالی ہند کے بادشاہوں کے ساتھ کرتا۔ اِن کے بڑھاپے کے عشق کا قصہ یا تو ایک کہانی ہے یا پھر اس کا محل اور مقام بدلا ہوا ہوگا۔

بہرحال خسرو کے بعد تین چار سو سال تک شمالی ہند میں کھڑی بولی ادب و شعر سے محروم رہی۔ اس زبان میں اردو یا ریختہ کے نام سے شاعری تقریباً عہد محمد شاہ سے پھر شروع ہوئی اور یہیں سے دہلوی ہندوی کا دورِ نشاۃِ ثانیہ شروع ہوتا ہے۔ اردو کے طلوع ہوتے ہی فارسی ماند پڑنے لگی۔ اور اردو شاعری ترقی کرتی ہوئی میر و غالب و انیس تک پہنچ گئی۔

خالق باری

امیر خسرو کی سب سے مقبول ہندی نظم خالق باری ہے۔ جسے پچھلے سات سو برس میں ہزاروں خطاطوں نے زیور کتابت سے سجایا اور پچھلے سو برس میں جس کے درجنوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

بادی النظر میں یہ کتاب ایک مکتبی نظم معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقتاً تاریخ زبان میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یہ ہندی کا پہلا لغت ہے جو اپنے مترادف عربی و فارسی الفاظ کے ساتھ بصورتِ منظوم ہمارے پاس آج بھی موجود ہے۔

خسرو کی ولادت سے تیس پینتیس سال پہلے ۶۱۷ھ میں ابونصر فراہی نے ع. بی الفاظ کی تعلیم کے لئے افغانستان کے شہر فراہ میں مختلف الوزن قطعات کا ایک منظوم نصاب "نصاب الصبیان" کے نام سے تیار کیا تھا۔ جو مکتبوں میں بہت مقبول ہوا۔ قرینِ قیاس یہی ہے کہ خسرو نے اپنے زمانۂ مکتب میں "نصاب الصبیان" پڑھا ہوگا اور اس نصاب کے انداز و اسلوب کے جو نقوش خسرو کے ذہن میں رہ گئے۔ شاید انھیں کا نتیجہ "خالق باری" کی تصنیف ہے۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ خالق باری خسرو نے اوائل عمر میں تصنیف کی ہے۔ مکتبی تعلیم میں پڑھی ہوئی کتاب "نصاب الصبیان" کے انداز کا اثر خالق باری میں واضح

طور پر نظر آتا ہے۔ جیسے۔

نصاب الصبیان ؎

سوار دست برنجن چو پائے را خلخال
وشاح عقد حمائل رعاث و تاج افسر

خالق باری ؎

دست برنجن کنگن کہیے پائل ہو خلخال
پائے برنجن چوڑا کہیے خوبی حسن و جمال

نصاب الصبیان ؎

عقار قہوہ دراح و مدام قرقف مے
کمی دلاور و فارس سوار و صید شکار

خالق باری ؎

بادہ شراب و رادق و صہبا مئے ست مد
گر جرعہ زاں خوری تو کنی کار نیک بد

نصاب الصبیان کا یہ تاثر ظاہر ہے اوائل عمر ہی میں زیادہ گہرا رہا ہوگا۔ لہٰذا امکان اسی بات کا ہے کہ خسرو نے خالق باری دس پندرہ سال کی عمر یعنی سنہ ۶۶۰-۶۶۵ھ میں لکھی ہو۔ خسرو سا جوہر قابل (جینیس genius) پندرہ سال کی عمر میں ایسی کتاب یقیناً لکھ سکتا تھا۔

خالق باری کو ایک طرح سے فارسی کا پہلا لغت بھی کہا جا سکتا ہے۔ ایران کا پہلا فارسی "لغت نامہ" تالیف ابو منصور علی ابن احمد اسدی طوسی جو فرہنگ یا لغتِ فرس اسدی طوسی" کے نام سے مشہور رہا۔ اسی زمانے میں لکھا گیا ہے۔ ایران کے عالم لغت آقائے سعید نفیسی نے اپنے ایک فاضلانہ فارسی مضمون "فرہنگ ہائے پارسی" میں

(جو برہانِ قاطع چھاپ ایران میں شامل ہی) لغت فرس اسد طوسی کا عہد تصنیف بہ دلائل قوی ۶۵۰ھ سے ۶۶۵ھ تک بتایا ہی خالقِ باری کی تصنیف کا بھی یہی زمانہ ہی۔

فارسی کا ہندوستانی لغتِ اول "فرہنگ نامہ قواس" بھی قریب قریب اسی عہد میں لکھا گیا ہی۔ قواس جس کا پورا نام فخر الدین مبارک شاہ قواس غزنوی ہی جو دربارِ علاؤ الدین خلجی (۶۹۵ھ سے ۷۱۵ھ تک) کا شاعر تھا۔ قواس کا فرہنگ نامہ علاؤ الدین خلجی کی حکومت کے بیس سال کے اندر ہی مکمل ہوا ہی۔ یہ بھی ممکن ہو سکتا ہی کہ تدوین کا کام قواس نے اس حکومت سے پہلے ہی شروع کر دیا ہو۔ فرہنگ نامۂ قواس اب بالکل مفقود ہو چکا ہی۔ صرف اس کے حوالے پرانے لغتوں میں ملتے ہیں۔

خالق باری چونکہ زبان ہندوی کی ترویج و تشکیل کے لئے ہی۔ لہٰذا اسے ہندی لغت کہنا زیادہ مناسب ہی۔ بحیثیت زبان فارسی کو خالق باری سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہی۔ لیکن اس کتاب نے ہندوی کی ترویج میں ایک زبردست خدمت انجام دی ہی۔ فارسی الفاظ کا بھی جو ذخیرہ خالق باری میں ہی۔ وہ ہندی الفاظ ہی کی طرح ہمارا ہی۔ اور ہم آج تک ایسے خود اہلِ ایران سے بہتر طریقے پر استعمال کر رہے ہیں۔

خسرو اور تعمیرِ زبانِ ہند خسرو اس عہد کے شاعر ہیں جب ہندوستان میں ایک نئی زبان پیدا ہو رہی تھی۔ اس زبان کے مستقبل پر خسرو کو پورا اعتماد تھا اور وہ اس نو عمر ادب کی نہایت خلوص سے خدمت کر رہے تھے ان کی ہندوی شاعری میں ایک طرف اگر تفکر و ترنم ہی تو دوسری طرف اس میں تعمیرِ زبانِ ہند کی ایک زبردست تحریک بھی چل رہی ہی۔ خسرو کی ہر موقع پر یہی کوشش رہی ہی کہ فارسی اور ہندی الفاظ شیر و شکر کی طرح گھل مل جائیں۔ تاکہ مستقبل کی ہندوستانی زبان کے لئے ارتقا کا راستہ تیار ہو سکے۔

خسرو کے ہندی کلام میں یہ افادی کوشش اکثر جگہ اصل شاعری سے زیادہ

نمایاں ہو۔ ان کی پہیلیاں، دو سخنے، مکرنیاں وغیرہ لطف شاعری کے ساتھ تعلیم لغت کے سبق ہیں۔ کہیں کہیں اپنے فارسی کلام میں بھی وہ اپنی مادری زبان ہندی کے الفاظ اور محاورے بڑی خوبصورتی سے نظم کرتے ہیں جن کا مقصد قطعاً یہی ہو کہ ان دونوں زبانوں کو قریب سے قریب تر لایا جائے۔ دیکھئے "دُر دُر موئے" کا نسوانی محاورہ ایک فارسی رباعی میں کس خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔

رُباعی

رفتم بہ تماشائے کنار جوئے
دیدم بہ لبِ آب زن ہندوئے
گفتم صنما بہائے زلفت چہ بود
فریاد برآورد کہ "دردر موئے"

ہندی ہی کی طرح فارسی میں الفاظ کی صوری و معنوی جانچ پرتال خسرو کا دلچسپ مشغلہ تھا انھوں نے بیسیوں حیرتناک لفظی اور معنوی صنعتیں ایجاد کی ہیں۔ اگر یہ دیکھنا ہو کہ خسرو لفظوں سے کس طرح شطرنج کھیلتے تھے تو ان کی تصانیف دیباچہ غرۃ الکمال اور اعجازِ خسروی پڑھئے۔ ہمارے ادب میں شاید اتنا زبردست قادرِ لغت کوئی نہیں ہوا ہو۔ خسرو عربی، فارسی، ترکی اور سنکرت ..... کے عالم تھے اور ان زبانوں کے لغت پر انھیں قدرت کامل حاصل تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی بعض صوبائی زبانیں بھی جانتے تھے۔

خالق باری کے متعلق روایات خالق باری کے لئے کہا جاتا ہو کہ یہ ایک ضخیم کتاب تھی۔ جواب مفقود ہو چکی ہو۔ موجودہ خالق باری اس کا کمبتی اقتباس ہو۔ اس روایت کی تائید کے لئے جس مواد کی ضرورت ہو وہ میرے علم میں نہیں لیکن اس روایت کو کئی مستند اہل قلم نے نقل کیا ہو۔

اس ضمن میں ایک دلیل ضرور کان لگتی ہو کہ خالق باری مختلف الوزن قطعات

کے اسباق ہیں بنی ہوئی ہے۔ ان میں سے کوئی سبق دس پندرہ شعر کا ہے اور کہیں صرف ایک شعر نظر آتا ہے۔ خود مصنّف اگر ان اسباق کی تقسیم کرتا تو ان کے اشعار کی تعداد میں کوئی مناسبت ضرور ہوتی۔ یہ بات قطعاً معقول ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسباق کی یہ تقسیم مصنّف کی نہیں۔ یا پھر مصنف کی کی ہوئی تقسیم میں وقت اور مکتب نے کافی قطع و برید کی ہے

ایک اور روایت ہے کہ خالق باری ان مہاجر ترکوں اور ایرانیوں کو ہندی سکھانے کے لئے لکھی گئی۔ جو چنگیزی فتنوں کی وجہ سے اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان آ گئے تھے اس قیاسی روایت کی تائید کے لئے ضخیم خالق باری کا وجود پایہ ثبوت کو پہنچنا ضروری ہے۔ جس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔

عام خیال خالق باری کے لئے یہی ہے کہ یہ ایک نصاب ہے جو ہندوستانی بچّوں کی تعلیم کے لئے تصنیف ہوا۔ خالق باری کا سب سے پرانا نسخہ بھی جو خسرو کی وفات کے گیارہ سال بعد ۷۳۶ھ میں مخطوط ہوا اور جس کی نقل نسخۂ ندوی اور نسخہ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی ہے۔ اسی خیال کی تائید کرتا ہے۔ اس نسخے کے کاتب نے اختتام کتاب پر چند اشعار تتمّے کے کہہ کر لکھ دیئے ہیں۔ جن میں وہ کہتا ہے ؎

امید است از فضل حق کریم
بخوانند و گردند طفلان علیم
کہ صبیان بر آیند از دام جہل
شود فیض الفاظ اشکال حل

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ خسرو کے انتقال سے گیارہ سال بعد بھی یہ کتاب بچّوں کو پڑھائی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ کاتب نے کہا ہے ؎

بہ تاریخ نکو سر انجام یافت
نصابِ ظریفی نکو نام یافت

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خالق باری کا نام نصابِ طریقی بھی تھا۔ ظاہر ہے نصاب بچوں کے لئے لکھے جاتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ان سے تعلیم کے شوقین بالغین بھی فائدہ اٹھا لیں

قیاس غالب یہی ہے کہ خالق باری بچوں کی کتاب ہے اور بچوں کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے اس میں مصنف نے ہر موقع پر نفسیاتِ اطفال کا خیال رکھا ہے۔ جیسے

۱۔ اس کتاب میں ظرافت سب سے نمایاں ہے اور بچے ہنسی کے گرویدہ ہوتے ہیں خالق باری کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہنسی ہنسی میں سیکڑوں لفظ بچوں کے حافظے میں پہنچا دیتی ہے۔

۲۔ یہ کتاب نظم میں ہے اور بچے نظم کو نثر سے جلدی یاد کرتے ہیں۔

۳۔ یہ کتاب مثنوی کی طرح ایک بحر میں نہیں لکھی گئی۔ اس کا ہر سبق ایک نئی بحر میں ملتا ہے۔ یہ تنوع بچوں کے ذہن کو بوجھل نہیں ہونے دیتا۔

خالق باری کے انداز پر تصنیفات | خالق باری کا اثر ابتدائی عہد میں علمی حلقوں پر کیا ہوا یہ ہمیں معلوم نہیں لیکن تعلیمی حلقوں میں اس کتاب نے ایک ہلچل پیدا کر دی ہندوستان میں ہندوی زبان کی تعلیم کا یہ پہلا اقدام تھا۔ جو اس وقت کی سرکاری زبان فارسی کو بھی ساتھ لئے ہوئے تھا۔ جو بولی بچہ گھر میں بولتا تھا اس کے لفظ مکتب میں پہلی مرتبہ اسے پڑھنے کو ملے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کتاب کی مقبولیت حد سے بڑھ گئی اور تھوڑے عرصے میں اس کے نسخے دلی سے نکل کر ہندوستان کے دوسرے شہروں میں پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ اس انداز کی تصنیفات کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ ان کتابوں کی ایک طویل فہرست محمود شیرانی مرحوم نے مرتب کی ہے۔ جن میں سے چند مشہور کتابیں حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ اللہ خدائی ۔ د۔ ۱۰۶۰ھ ۔ مصنف تجلی ۔ دہلی یا نواح دہلی میں لکھی گئی کئی بار چھپی۔

۲۔ فرح صبیان۔ (اللہ خدائی کے عہد کے قریب) مصنف شیخ اسحٰق لاہوری۔

۳۔ صمد باری۔ (بارھویں صدی ہجری ماہ ربیع الاول) مصنف عبدالواسع۔
کئی بار چھپی۔ اس میں الفاظ مختلف عنوان کے تحت جمع ہیں۔ جیسے غلہ۔ ادویات ترکاریاں وغیرہ

۴۔ نصاب مصطفیٰ۔ (۱۲۳۶ھ) نصابوں کی روایت کے خلاف اس میں تقریباً
آٹھ سو شعر ہیں۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے۔

۵۔ قصیدہ لغتِ ہندی۔ (۹۵۰ھ) یہ ایک چھوٹا سا قصیدہ ہے جس کی خصوصیت
یہ ہے کہ اسے ایک ایرانی حکیم یوسفی ہروی نے نظم کیا جس نے بڑی کوشش سے ہندی سیکھی تھی
اس کے علاوہ قادر نامہ (مرزا غالب) اللہ باری (۱۲۰۷ھ) از احسن، قادر باری (۱۲۱۰)
از فیاض۔ اور ایزد باری، احمد باری۔ فیض جاری وغیرہ وغیرہ لکھی گئیں۔
کئی نصاب خود خالق باری کے نام سے لکھے گئے جیسے۔ خالق باری محمد اکرم، خالق باری
غلام علی شاہ۔

پنجابی میں بھی اس طرح کی تصنیفیں برابر ہوتی رہیں جیسے:۔

۱۔ رزاقِ باری۔ (۱۰۷۱)، از اسماعیل۔

۲۔ ایزد باری۔ (۱۰۵ھ)، از کھتری بیسر سال داس۔

۳۔ صنعتِ باری۔ (۱۲۰ھ) گنیش داس قانون گو اور۔
واسع باری۔ ... ... ناصر باری۔ اعظم باری۔ صادق باری اور درجنوں دوسری
کتابیں۔

کہتے ہیں گجراتی اور تلنگی تک خالق باری کا اثر پہنچا ہے۔
اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ امیر خسرو کی کوئی کتاب نہ خالق باری سے زیادہ چھپی
اور نہ اس سے زیادہ مقبول ہوئی۔ نیز ترویج زبان کا جو کام اس کتاب نے کیا ہے۔ اس کی
مثال مشکل ہی سے کوئی دوسری کتاب ہو سکے گی۔

محمود شیرانی اور خالق باری | مرحوم پروفیسر شیرانی نے بڑی کوشش اور کاوش سے ایک کتاب خالق باری پر لکھی ہو۔ جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہو کہ مشہور و معروف ہندی نظم خالق باری امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہو۔ میں شیرانی صاحب کی نکتہ رسی کا بدل مداح ہوں لیکن ان کی اس مخصوص تصنیف میں محققانہ نکتہ سنجی سے زیادہ اپنے مفروضہ نظریے کیلئے توجیہہ تراشی آگئی ہو۔ خوش قسمتی سے یہ توجیہات مزاج عہد سے اتنی موافق تھیں کہ انھیں عوام کے علاوہ خواص کے ذہن نے بھی آسانی سے قبول کر لیا ہو۔ میں شیرانی مرحوم کی اس تصنیفِ عالیہ کو ان کے عہد کی ایک جذباتی آواز کہوں گا۔

خالق باری کے متعلق یہ نظریہ بصورت اعتقاد خود شیرانی مرحوم اور ان کے ماحول میں پہلے ہی سے موجود تھا۔ جسے بزورِ علمیت موصوف نے ایک مدلل نظریہ بنا کر ۱۹۲۸ء میں اپنی فاضلانہ تصنیف "پنجاب میں اردو" میں اجمالاً پیش کیا۔ شیرانی ایسے محقق کا رجحان دیکھ کر بابائے اردو مولانا عبد الحق مرحوم نے اس نظریے کی تکمیل کے لئے خالق باری کا ایک مخصوص مخطوطہ شیرانی صاحب کو مرحمت فرمایا۔ یہی نسخہ شیرانی مرحوم کے نظریے کی بنیاد ہو۔

اس نسخے کے لئے کہا گیا ہو کہ ۱۱۸۷ء میں اس کی کتابت سورت میں ہوئی اور اس کے کاتب سید یاسین ولد سید طاہر عرف خوب صاحب ہیں۔ اس نسخے کو ایک ایسے نسخے کی نقل بتایا گیا ہو۔ جسے کسی بابا اسحاق حلوائی کی فرمائش پر ضیاء الدین خسرو نے ۱۰۳۱ھ میں بطریق ریختہ عربی فارسی الفاظ کو ہندی گوالیاری میں ترجمہ کرکے نظم کیا۔ مفروضہ مصنف نے اس کتاب کا نام حفظ اللسان رکھا ہو۔ اور اس کا مادۂ تاریخ تصنیف نثر میں "تصنیف آخر" نکالا ہو۔

یہ سورتی نسخہ اس کتاب کی نقل بتایا جاتا ہو جو ۱۰۳۱ھ میں بابا اسحاق حلوائی کی فرمائش پر تصنیف ہوئی۔ میں کسی پیشہ کی توہین نہیں کرتا۔ لیکن اس پرانے جاگیردار سماج میں جو کتاب ایک حلوائی کی فرمائش پر لکھی جائے اس کے ساقط الحیثیت ہونے میں کوئی شبہہ

نہیں رہتا۔ اگر مفروضہ مصنّف ضیاء الدین خسرو کا کوئی وجود مان لیا جائے تو بہ ظاہر وہ ایک حلوائی دوست مکتب کے ملّا ہوں گے۔ ان کی شخصیت ان کی کتاب کے مادۂ تاریخ "تصنیف آخر" سے واضح ہو جاتی ہے۔ بیچارے ملّا صاحب تاریخ کے لیے چند مصرعے بھی موزوں نہ کر سکے۔ پھر "تصنیف آخر" مادۂ تاریخ کیا ہوا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی قصبے میں ملّا ضیاء الدین کے پاس امیر خسرو کی خالق باری ہو اور انھوں نے اپنی قند و شیرینی کے لئے وہاں کے بابا اسحاق قنّاد کو فریب دیکر اسے اپنی تصنیف بنایا ہو۔ نیز اس کتاب کا مصنّف بننے کے لئے اپنا تخلّص خسرو رکھ لیا ہو۔ بابا اسحاق کا تعلق قند و شیرینی کے علاوہ اگر فنِ علم و فضل سے بھی ہوتا تو اس زمانے کے رواج کے مطابق مصنّف کتاب ملّا ضیاء الدین ان کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ ضرور کرتے۔ مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کو بابا اسحاق قنّاد کی فرمائش قرار دینے والے مصنّف کو اپنے ممدوح کے لئے بابا اور قنّاد کے علاوہ کوئی اور صفت نہ مل سکی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسحاق بابا محض حلوائی ہیں۔

عہدِ اسلام کے بعض پیشہ ور علماء اور شعرا کی مثال ہندو طبقاتی تعلیم سے متاثر مغل جاگیردار سماج پر منطبق کرنا درست نہیں ہوگا۔

نظریۂ شیرانی حیرت ہے کہ ایسے مجہول الحیثیت نسخے کو اپنے نظریے کی بنیاد بنا کر شیرانی صاحب نے خالق باری کو ۱۰۳۱ھ کی تصنیف قرار دیا ہے۔ اور اس کے مصنّف کا نام ضیاء الدین خسرو مان کر ارشاد فرمایا ہے کہ تجانس اسمی کی وجہ سے یہ کتاب امیر خسرو کے نام سے مشہور ہو گئی ہے۔

"خالق باری کے مصنّف امیر خسرو ہیں" اس نظریے کو سات سو سال سے برابر مانا جا رہا ہے۔ پھر خالق باری کا نسخۂ ندوی متعلقہ ۱۰۳۶ھ شیرانی صاحب کے علم میں ہے۔ اور اسے وہ مستند مانتے ہیں۔ اس کے بعد بھی خالق باری کو ۱۰۳۱ھ کی تصنیف بنانے کی کوشش میری سمجھ میں نہ آسکی۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ خالق باری شیرانی صاحب کے لیے بارِ ذوق ہو اور

ان کی پوری کوشش یہ ہو کہ ایسی لغو ہندی کتاب کا رشتہ امیر خسرو علیہ الرحمۃ سے باقی نہ رہنے دیں۔

خالق باری کی روایت کا تواتر۔ خالق باری کی روایت کا تواتر ہمارے علم میں سنہ ۷۳۶ھ کے اس نسخۂ خالق باری سے شروع ہوتا ہو جو امیر خسرو کی وفات کے گیارہ سال بعد مخطوط ہوا اور جس کی خبر ہمیں نسخۂ ندوی اور نسخۂ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی بھی دیتے ہیں اس کے بعد یہ روایت دو چار ناقابل ذکر قیاسی اور ظنی واقعات سے گذرتی ہوئی "اللہ خدائی" کے سال تصنیف تک پہنچی ہو۔ "اللہ خدائی" خالق باری کے سلسلۂ نسل کی وہ قدیم ترین کتاب ہو جو ہمارے پاس اس وقت بھی موجود ہو۔

خالق باری اور اللہ خدائی کے درمیان سنہ ۹۵۰ھ میں قصیدے کے انداز پر حکیم یوسفی نے قصیدہ لغت ہندی کہا۔ یہ قصیدہ شر۔ نظر اور قمر کے قافیوں میں "فاعلاتن فاعلاتن - فاعلات" کے وزن پر ہو۔

سنہ ۹۹۰ میں ایک اور ہندی فارسی کا منظوم نصاب "مقبول صبیان" کے نام سے لکھا گیا۔ جو طبع نہیں ہوا۔ اس کا صرف ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں ہو۔ جس کی صراحت سید ہاشم نائب معتمد انجمن ترقی اردو نے محمود شیرانی صاحب کو بھیجی ہو۔ یہ صراحت حفظ اللسان کے صفحہ ۵۸ پر درج ہو۔

اسحٰق غنی کی 'فرح صبیان' بھی تقریباً اسی زمانے میں تصنیف ہوئی جب "اللہ خدائی" لکھی گئی ہو۔

ان تصنیفات سے ایک بات تو بالکل واضح ہو جاتی ہو کہ خالق باری اور اللہ خدائی کے درمیان کے عہد میں بھی اس قسم کے ہندی فارسی منظوم لغت برابر تصنیف ہوتے رہے۔ جن میں سے بیشتر اب مفقود ہو چکے ہیں۔ یہ تصنیفات یقیناً خالق باری ہی کے زیر اثر ہوئی ہیں۔

اللہ خدائی کا مصنف تجلّی ۱۰۶۰ھ میں اپنی کتاب تصنیف کرتے ہوئے اپنے نقش اوّل کے مصنف امیر خسرو کی روح سے اس طرح امداد کا طالب ہے

شاید از لطف و رحمت باری
روح خسرو نمایدم یاری

مندرجۂ بالا شعر میں لفظ خسرو نظم ہوا ہے۔ اس سے شیرانی صاحب کے ضیاء الدین خسرو کو مراد نہ لیا جائے۔ تجلّی امیر خسرو کے ساتھ ان کے مرشد نظام الدین اولیاء سے بھی امداد کی درخواست کرتا ہے:۔

بہرِ مرغِ سخن۔ بنہادم دام
مدد لے خواستم۔ ز روح نظام

ظاہر ہے اس کے بعد تجلّی کا مطلب امیر خسرو کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس بات سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے ۱۰۶۰ھ میں اس قصبے کا ایک مصنف خالق باری کو امیر خسرو کی تصنیف سمجھتا ہے۔

یہاں پر ایک اور بڑا اہم نکتہ قابلِ غور ہے۔ مکتب کی مقبول ترین کتاب خالق باری بہ قولِ شیرانی صاحب ۱۰۳۱ھ میں ضیاء الدین خسرو تصنیف کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ۱۰۶۰ھ تک پچیس۔ تیس برس میں یہ کتاب اپنے صحیح خد و خال کے ساتھ آندھی کی طرح پھیلی ہو گی جس سے متاثر ہو کر تجلّی نے "اللہ خدائی" لکھنے کا فیصلہ کیا۔ کتنی مضحک بات ہے کہ تیس برس کے اندر مقتدی اپنے مبتدی کا نام بھول کر امیر خسرو کی روح کے پاس امداد مانگنے پہنچ گیا۔

اس موقع پر شیرانی صاحب نے حقیقت سے ایک نہایت غیر معقول فرار اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ "اللہ خدائی" میں خسرو کا ذکر آنے کی توجیہہ تراشی اس طرح کرتے ہیں کہ اللہ خدائی کا مصنف تجلّی جماعتِ صوفیاء سے گہری عقیدت رکھتا تھا۔ اسی لئے اس نے خسرو اور نظام الدین اولیاء سے امداد طلب کی ہے۔ اس قسم کی سخن پروری شیرانی ایسے

محقق کو زیب نہیں دیتی۔

تجلی نقش بندی خانوادے کا مرید تھا اور وہ اللہ خدائی میں اپنی اس عقیدت کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے:۔ ؎

گر مرا نیک او فتد یا بد
خواہم از نقش بند خواجہ مدد
دارم امید جرعہ از جامش
زانکہ مشکل کشائے شد نامش

نقش بند خواجہ سے طلب امداد کے بعد عقیدت کی بات ختم ہو جاتی ہے اور تجلی اپنے بادشاہ شاہجہاں کی تعریف و توصیف میں مصروف ہوتا ہے۔ آخر میں وہ اس کتاب کے نقش اول کے مصنف امیر خسرو کی طرف رجوع کرتا ہے ؎

شاید از لطف و رحمت باری
روح خسرو نماید م یاری

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر یہ طلب امداد مذہبی عقیدت مندی کی وجہ سے ہوتی تو یہ اشعار بادشاہ کی مدح سے پہلے نقش بند خواجہ کے ذکر کے ساتھ آئے ہوتے۔

دوسرے یہ کہ اگر تجلی کو چشتیہ خانوادے سے طلب استعانت کرنا تھا تو پہلے اس کے سامنے ہندوستان کے بے تاج کے بادشاہ خواجہ معین الدین چشتی کا نام آتا جن سے سارا ہندوستان مدد مانگتا ہے۔ اس کے بعد خواجہ بختیار کاکی، خواجہ فرید الدین گنج شکر اور خواجہ نظام الدین اولیاء کے نام آتے۔ امیر خسرو ان شیوخ کی صف میں قطعاً نہیں آتے۔ وہ شیخ نہ تھے مرید تھے اور اسی ارادت میں ان کے کردار کا بہترین پہلو نکھر کر سامنے آتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذہبی عقیدت مندی سے الگ تجلی نے اپنے مقتدی مصنف امیر خسرو کا ذکر کر رہا ہے اور ان کی روح سے طالب امداد ہے۔ خواجہ نظام الدین کا ذکر صرف اس لئے آیا ہے کہ

وہ خسرو کے مرشد ہیں اور خسرو کی روح ان کے ذکر سے مسرور ہو جائے گی۔

تیسرے خود اللہ خدائی کا نام اس امر کا بیّن ثبوت ہو کہ وہ خالق باری کا نقش ثانی ہو۔ اس کتاب کا نام اللہ خدائی خود تجلّی نے رکھا ہو ؎

چوں بہ فضل خدائے گشت تمام
کردم "اللہ خدائی" ایں نام (اللہ خدائی آخری شعر)

اللہ خدائی مانوس اور رواجی ناموں سے بالکل الگ نام ہو اور اسے ذہن صرف اسی وقت پیدا کر سکتا ہو جب شعور میں خالق باری کا مقبول نام موجود ہو۔

خالق باری بھی رواجی نام نہیں۔ دراصل یہ نام خالق باری کے پہلے مصرع "خالق باری سرجن ہار" کی وجہ سے از خود مشہور ہو گیا۔ مکتب کی مقبول کتابوں میں نام کی یہ صورت بہت عام ہو جیسے کریما۔ امقیماں یہ نام کتاب کے ابتدائی لفظوں سے وضع کر لئے ہیں

اللہ خدائی کے اس شعر کے لئے ؎

شاید از لطف و رحمت باری
روح خسرو نمایدم یاری

پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیب رضوی نے ارشاد فرمایا ہو کہ اس شعر کے پہلے مصرع میں لفظ باری خالق باری کی طرف اشارہ کر رہا ہو۔ پروفیسر صاحب موصوف نے یقیناً ایک بیحد باریک بات کی طرف توجہ دلائی ہو۔ جس پر اس وقت تک کسی محقق کی نظر نہیں پہنچ سکی اس شعر کے مصرع اول میں باری اور مصرع دوم میں خسرو کا آنا اس بات کی ایک اور مضبوط دلیل ہو کہ تجلّی کے ذہن میں امیر خسرو کی خالق باری واضح طور پر موجود تھی لیکن شیرانی صاحب نے اس دلیل کو بھی رد کرنے کی سعی بیجا کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر تجلّی کے ذہن میں خالق باری کا نام ہوتا تو وہ مصرع اول یوں کہتا ع

شاید از لطف خالق باری

شیرانی صاحب کی اس اصلاح عالیہ پر سچ مچ حیرت ہوتی ہے۔ خالق اور باری دونوں ہم معنی لفظ ہیں۔ ان پر اضافت لگا کر خالقِ باری کہنا بجائے تضحیک غلط ہے۔ ایسی غلطی تو مکتب کا ایک معمولی فارسی داں بھی نہیں کرے گا۔ تجلی تو بہر حال ایک شاعر تھا۔ خالق باری کی غلط اور مہمل ترکیب وہ کیونکر نظم کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ خدائی کے مذکورہ بالا شعر میں باری اور خسرو کا ایک ساتھ ہونا اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ تجلی کے ذہن میں خسرو کی خالق باری کا نام واضح طور پر موجود تھا۔

خالق باری کی روایت پھر قیاسات کے مبہم راستوں سے گذرتی ہوئی اردو کے پہلے محقق خانِ آرزو (متوفی ۱۱۶۵ھ) تک پہنچتی ہے اور غرائب اللغات میں خانِ موصوف خالق باری کو امیر خسرو کی تصنیف مان کر اس سے سندیں پیش کرتے ہیں۔ ان اسناد کو خود شیرانی صاحب نے اپنی ایک کتاب میں نقل کیا ہے۔

خانِ آرزو ہندی لفظ "اونن" کے لئے کہتے ہیں "در ہندی ایطبنرہ شدہ را گویند" اس کے بعد اس لفظ کے غلط معنی رائج ہو جانے کا سبب یہ بتلاتے ہیں کہ "حضرت امیر خسرو در رسالۂ خود "اونن" بمعنی تیغ گفتہ" شیرانی صاحب بتلاتے ہیں کہ خانِ آرزو کا اشارہ خالق باری کے اس شعر کی طرف ہے :- ؎

خنجر و شمشیر و صمصام است تیغ
ہندوی کھانڈا کھادے "ان من" تیغ

مطبوعہ خالق باری کے نسخوں میں "اونن" کی جگہ "ان من" ملتا ہے۔ لیکن شیرانی صاحب مانتے ہیں کہ قدیم قلمی نسخوں میں "اونن" "اونون" یا "اون" تحریر ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خانِ آرزو کے وقت میں جو نسخے رائج تھے ان میں اب جابجا تحریف ہو گئی ہے۔

"غرائب اللغات" میں ہندی لفظ "چھرا" کے لئے خانِ آرزو تحریر فرماتے ہیں کہ "کارد بزرگ یہ تازی ساطور خوانند .... در رسالۂ منظومۂ امیر خسرو

چھرا بہ معنی استرہ است و مشہور در قصبات ہندوستان، ہمیں است" شیرانی فرماتے ہیں کہ خانِ موصوف کا اشارہ خالق باری کے اس شعر کی طرف ہے:۔ ؎

جاروب سوہنی کہ سبد است ٹوکرا

مقراض کترنی کہ بود استرہ چھرا

عرائب اللغات میں "ماڑھی" کے معنی خان آرزو یہ بتاتے ہیں کہ "عمارتے کہ بر قبر آتش پرستاں و یہوداں سازند ...... لیکن بہ معنی بام ہم است۔ چنانچہ از رسالۂ امیر خسرو علیہ الرحمۃ معلوم میشود"۔ شیرانی صاحب فرماتے ہیں کہ خانِ موصوف کا مقصود خالق باری کا یہ شعر ہے:۔ ؎

قصر کوشک حصن در تازی حصار

حجرہ کوٹھا، بام ماڑی، در دوار

یہاں ایک بات قابل لحاظ ہے کہ خان آرزو نے خالق باری سے جتنے اسناد پیش کئے ہیں وہ سب ہندی الفاظ ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ علمائے متقدمین خالق باری کو ایک ہندی لغت سمجھتے تھے۔

بہرحال خان آرزو بھی خالق باری کو صرف امیر خسرو کی تصنیف ہی نہیں قابل سند تصنیف سمجھتے تھے۔ خان موصوف کے بعد سے آج تک تاریخ ادب پوری طرح روشنی میں ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں۔ تمام محققوں نے بالاتفاق خالق باری کو امیر خسرو سے منسوب کیا ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے دیئے ہوئے ایک مشکوک نسخے کی بنا پر جو بابا اسحاق حلوائی سے منسوب ۱۰۳۱ھ کے ایک مجہول الحیثیت نسخے کی اصل بھی نہیں بلکہ صرف اس کا پتہ دیتا ہے۔ ہم سات سو سال کے اتنے زبردست تاریخی تواتر کو کسی طرح رد نہیں کر سکتے۔

خالق باری کا نسخہ ندوی متعلقہ ۱۰۳۶ھ جس کی تائید اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کے نسخے سے ہوتی ہے، ۱۰۸۰ھ میں خالق باری کے تصنیف ہونے کے نظریے کو عقلاً محال بنا دیتا ہے۔ جو کتاب ۱۰۳۶ھ میں موجود تھی وہ ۱۰۳۱ھ میں کیونکر تصنیف ہو سکتی ہے۔ خود شیرانی صاحب بھی نسخۂ ندوی کے استناد کے قائل ہیں۔

نسخۂ ندوی

نسخۂ ندوی محترمی جناب پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی کی ملکیت ہے اور اس بحث کی سب سے اہم کتاب ہے۔ افسوس ہے کہ ندوی صاحب کے تبدیل مکان کے سلسلے میں موصوف کی کتابیں بے ترتیب ہو گئی ہیں اور اس وقت یہ نسخہ نہیں مل سکا۔ لہٰذا میں اس نسخے کے متعلق صرف وہی معلومات پیش کروں گا جو خود شیرانی صاحب نے اپنی کتاب میں ارقام فرمائی ہے شیرانی صاحب خبر دیتے ہیں کہ نسخۂ ندوی کے خاتمے پر حسبِ ذیل عبارت تحریر ہے۔

"تمت، تمام شد نسخۂ نصاب ظریفی مشہور بہ کتاب خالق باری بتاریخ ہشتم شہر ربیع الثانی کاتب الحروف من بندۂ حقیر نوروز بن موبداں شاپورجی معروف بہ شائستگان"

شیرانی صاحب نے فرمایا ہے کہ "اس سے آگے کی عبارت پر سیاہی پھری ہوئی ہے"۔

میرا خیال ہے کہ یہ کتاب سرقہ کر کے بیچی گئی ہے۔ سیاہی پھری ہوئی عبارت میں کوئی نشاندہی ایسی ہو گی جس سے سارق پکڑا جا سکتا تھا۔ بغیر سیاہی پھری ہوئی مندرجۂ بالا عبارت سے حسب ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں:-

۱۔ اس کتاب کو خالق باری کے علاوہ نصاب ظریفی بھی کہا جاتا تھا۔

۲۔ اس نسخہ کی کتابت آٹھویں ربیع الثانی کو تمام ہوئی (بغیر سیاہی پھری عبارت میں سنہ مرقوم نہیں۔)

۳۔ اس کتاب کا کاتب ایک پارسی نوروز بن موبداں شاپورجی ہے۔ جو فارسی عبارت اوپر نقل کی گئی ہے وہ نسخۂ ندوی کے پارسی کاتب نوروز بن موبداں شاپورجی کی تھی۔ لیکن یہ نسخہ جس نسخے کی نقل ہے وہ خالق باری کا سب سے پرانا نسخہ ہے۔ جس کی

کتابت امیر خسرو کی وفات کے گیارہ سال بعد ۷۳۶ھ میں ہوئی۔

زیرِ غور نسخہ ندوی کس سنہ کا ہے۔ یہ تو پتہ نہیں چلا۔ لیکن خود شیرانی صاحب بھی اسے کافی پرانا اور معتبر نسخہ[1] مانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس کی کتابت سورت یا کھمبات میں ہوئی ہے۔

نسخۂ ندوی میں سال کتابت کا پتہ نہ چلنے سے اس بحث پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ یہ نسخہ جس قدیم نسخے کی نقل ہے اس میں ساری تفصیلات موجود ہیں۔ ۷۳۶ھ کے نسخے کے کاتب نے خاتمۂ کتابت پر اپنا ایک منظوم تتمہ درج کیا ہے جس سے ساری ضروری باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔ کاتب کا منظوم تتمہ شیرانی صاحب نے بھی نقل کیا ہے:۔ ے

چو بگرفت ایں نسخۂ طرزنوی
ز تصنیف آں خسرو پہلوی
ز اتمام عاشورہ یک ہفتہ شد
کہ ایں گوہرِ بے بہا سفتہ شد
امید است از فضلِ حق کریم
بخوانند و گردند طفلاں علیم
بہ تاریخ نحو سر انجام یافت
"نصابِ ظریفی" نکو نام یافت
ز ہفت صد فزوں سی و شش سال بود
کہ طبع از خرد دستِ یاری نمود
کہ صبیاں برآیند از دامِ جہل
شود فیض الفاظ اشکال حل

---

[1] حفظ اللسان شیرانی صفحہ ۷۵ نسخہ (یعنی نسخۂ ندوی) محترمی جناب پروفیسر نجیب اشرف ندوی پروفیسر انجمن اندھیری کا مملوکہ اور قابلِ اعتبار نسخہ ہے۔" (شیرانی) اس کے بعد شیرانی صاحب نے اس نسخے کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔

کاتب کی ناقص شاعری کو نظر انداز کر کے ہمیں صرف اس تتمے کے مطالب پر غور کرنا ہے۔ اس کتاب کو کاتب اپنی تصنیف نہیں بتاتا۔ وہ کتاب کے مصنف کو "آں خسرو بہلوی" کہتا ہے جو بصیغۂ غائب اس کی ذات سے الگ ایک اور شخصیت ہے۔

خسرو بہلوی نسخۂ ندوی کے پارسی کاتب نوروز کی خامہ فرسائی ہے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی میں رجب ۱۲۶۱ھ کا لکھا ہوا ایک اور خالق باری کا نسخہ موجود ہے جس کے کاتب قاضی قاسم علی ہیں۔ اور جو کسی ناگر برہمن لڑکے کی تعلیم کے لئے مخطوط ہوا ہے۔ اس نسخے میں بھی نسخۂ ندوی میں نقل کئے ہوئے تتمے کے اشعار کاتب من وعن موجود ہیں لیکن اس میں "خسرو بہلوی" کی جگہ "خسرو دہلوی" مندرج ہے ع

زتصنیفِ آں خسرو دہلوی

۱۲۳۶ھ کے نسخے کی دو نقلیں اور ان میں تطابق اس نسخے کو مستند سے مستند تر بنا دیتا ہے۔

شیرانی صاحب کے پیش نظر نسخۂ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نہیں تھا۔ انھوں نے کاتب کے مندرجۂ بالا منظوم تتمے کو امیر خسرو سے منسوب کرنے سے انکار کیا ہے اور ان اشعار کی زبان پر اعتراضات کئے ہیں۔ میں خود بھی ان اشعار کو امیر خسرو سے منسوب نہیں کر رہا ہوں۔ تتمے کے یہ اشعار ۱۲۳۶ھ کے ایک نیم تعلیم یافتہ کاتب کے ہیں اور اس میں زبان وفن کے معیاروں کی تلاش فضول ہے۔

ان اشعار کی خصوصیت صرف یہ ہے کہ زبان وفن کے اغلاط کے باوجود ان سے عہد خالق باری کے متعلق ایک اہم حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔

شیرانی صاحب کی دو دلیلیں | بابا اسحاق حلوائی سے منسوب نسخۂ خالق باری کے مجہول الحیثیت ثابت ہو جانے کے بعد شیرانی صاحب کی بحث کا مدار صرف حسب ذیل دو

دلیلوں پر رہ جاتا ہے:-

دلیل اوّل:- خالق باری میں "دام" اور "دمڑا" سکوں کے نام نظم ہوئے ہیں لیکن ان سکوں کا رواج عہد اکبر سے ہوا جو عہد خسرو سے کئی سو سال موخر ہے۔ لہٰذا خالق باری عہد مغلیہ کی تصنیف ہے۔

دلیل دوم:- اپنی تصنیفات میں امیر خسرو نے چند لفظ کسی اور معنی میں نظم کئے ہیں۔ اور وہی لفظ خالق باری میں کسی دوسرے معنی میں نظم ہوئے ہیں۔ لہٰذا امیر خسرو اور مصنف خالق باری دو مختلف شخصیتیں ہیں

پہلے دلیل اول پر غور کیا جاتا ہے۔ خالق باری کے حسب ذیل شعر میں دام اور دمڑا نظم ہوئے ہیں۔

دانگ فلوس جو آہے پیکا جتیل دمڑا جان :: دام دانچہ کیہ کھبیہ جان سیکش تان

شیرانی صاحب فرماتے ہیں کہ دام اور دمڑا (دمڑی) سکوں کا رواج عہد اکبر سے شروع ہوا۔ یہ درست ہے کہ دام اور دمڑا عہد اکبر میں رائج تھے۔ لیکن ان کی ابتدا عہد اکبر سے ہوئی اس کا کوئی ثبوت شیرانی صاحب نے پیش نہیں کیا۔ سلطنت مغلیہ میں ایسے بہت سے سکّے رائج تھے جن کا رواج ما قبل عہد مغلیہ میں بھی رہا ہے جیسے:-

تنکہ:- سلطانوں کے عہد کا مشہور چاندی اور سونے کا سکّہ۔ یہ سکہ عہد مغلیہ میں بھی رائج تھا۔ جس کا ذکر اکبر نامے اور تزک جہانگیری وغیرہ میں برابر آیا ہے۔

دینار:- علاؤالدین خلجی کا سونے کا سکّہ جو عہد مغلیہ میں بھی رائج رہا۔ مغل تاریخوں میں دینار کا ذکر برابر ملے گا۔

جتیل:- یہ سکّہ سلطانوں کے عہد میں بھی رائج تھا اور اس کا رواج مغلوں کے عہد میں بھی رہا۔ ابوالفضل اور مغلوں کے دوسرے مورخوں نے اس سکّے کا ذکر اپنی تحریروں میں کیا ہے۔

گانی:- جتیل کے برابر کا ایک سکّہ تھا اور عہد خلجی میں "یک گانی، دو گانی، ہشت

گانی دو اور دہ گانی کے حساب سے چلتا تھا۔ یہ سکّہ عہدِ مغلیہ میں بھی رائج رہا اور اس کا ذکر تزکِ جہانگیری میں موجود ہے۔

عہدِ اکبری کی تاریخ اتنی تفصیل میں موجود ہے کہ جزوی باتوں کی تشریحات بھی ہمیں پوری طرح مل جاتی ہیں۔ میری نظر سے آج تک کسی مورّخ کا یہ بیان نہیں گزرا کہ دام اور دمڑا اور دمڑی اکبر کے زمانے سے رائج ہوئے۔ بلکہ دمڑا نام کا کوئی سکّہ غالباً اکبر کے زمانے میں رائج نہ تھا۔ البتہ دمڑی ضرور چلتی تھی۔ جو دام کا آٹھواں حصّہ سمجھی جاتی تھی۔ دمڑی کا رواج شمالی ہند میں پچاس سال پہلے تک رہا۔ لیکن اس وقت دمڑی نام کا کوئی سکّہ نہیں تھا۔ دمڑی کی قیمت آٹھ کوڑیاں ہوتی تھیں۔

ہندوستان کے ماہر سکّہ جات ڈاکٹر پرمیشری لال گپتا اپنے ایک انگریزی مقلے "خلجی سلاطین دہلی کے سکّے" مطبوعہ ۱۹۵۶ء میں "دام" کے لئے تحریر فرماتے ہیں کہ ایک پرانی کتاب "درویہ پریکھا" سے پتہ چلتا ہے کہ خلجیوں کے عہد میں "دام" موجود تھا اب تو ہمیں معلوم ہو چکا ہے "دام" لفظ "درام" द्रम्म یا دام द्रम्म (غالباً اپبھرنش) سے نکلا ہے۔ یہ دونوں لفظ مسلم حملے سے قبل قریب قریب دام ہی کے مفہوم کے ساتھ شمالی ہند میں موجود تھے۔

مولانا سلیمان ندوی مرحوم اپنی کتاب نقوشِ سلیمانی میں تحریر فرماتے ہیں کہ "دام" دراصل پرانا لفظ "درخم" ہے۔ جو یونانی تاجروں اور حملہ آوروں کے ساتھ عرب، ایران، اور ہندوستان آیا ہے۔ عربی میں یہ لفظ "درہم" بنا۔ فارسی میں "ہ" ساقط ہو کر "درم" رہ گیا۔ اور ہندوستان میں "ر" ساقط کر کے "د" کی آواز بڑھائی گئی اور "دام" ہو گیا۔ یہی لفظ انگریزی میں "ڈرام" ہو گیا۔

ظاہر ہے یونانی حملے کے بعد یہ لفظ شمالی ہندوستان میں رائج ہو گا۔ جس کی تائید گپتا جی بھی اپنے مقالے میں کرتے ہیں۔ بلکہ گپتا جی کے خیال کے مطابق اس لفظ کا تلفّظ

ڈرامہ انگریزی کے "ڈرام" سے ابتداہی سے مماثل تھا۔

اس بحث سے یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہوگی کہ "دام" ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے قبل بھی رائج تھا۔ اور مغلوں کے زمانے میں بھی رائج رہا۔ "دمڑا" قبل عہد مغل "دمڑا" ہوگا۔ جو عہدِ مغل میں "دمڑی" ہوگیا۔

امیر خسرو اور مصنف خالق باری دو الگ شخصیتیں ہیں" اپنی اس دوسری دلیل کی ضمن میں شیرانی صاحب خالق باری کے چند شعر پیش کرتے ہیں:۔

(۱)

فارسی سیمرغ و عنقا ہست ۔ تمدرو ۔ کبک ہنس
ہم چو یہ قانست کانور ہو زریرہ د نسل بنس

شیرانی صاحب کا ارشاد ہو کہ مصنف خالق باری نے تمدرو اور کبک کو ایک ہی پرندہ مانا ہے۔ مگر امیر خسرو قرآن السعدین میں ان دونوں طائروں کو دو الگ پرندے مانتے ہیں:۔

انکہ پریدے زبر خود تمدرو
ماندہ چو پر گم شدگاں دیر سرو
لادہ چو از کوہ برفت از شکوہ
کبک بہ برید دل از تیغ کوہ

خالق باری کا مصنف لائق ہو یا نالائق۔ لیکن تمدرو اور کبک کو ایک پرندہ نہیں سمجھ سکتا۔ علم اور لغت کو ایک طرف رکھیئے۔ یہ باتیں تو سماعت اور مشاہدے سے بچوں کو بھی آجاتی ہیں۔ زیر غور مصرعے "فارسی سیمرغ عنقا ہست ۔ تمدرو کبک و ہنس" میں ترتیب الفاظ، لفظ اور ترجمے کے انداز پر قطعاً نہیں۔ سیمرغ ۔ عنقا ۔ تمدرو ۔ کبک اور ہنس ان میں سے کسی طائر کو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ معلوم یہ ہوتا

ہو کہ یہ تصرّف ہو جو خالق باری میں بہت پہلے ہی ہو گیا ہو۔ جس کی وجہ سے بعض پرانے لغت نویس بھی غلطی کا شکار ہوئے ہیں۔

اسی طرح کا ایک اور غلط مصرع خالق باری میں ملتا ہو۔ جس میں عنقا کو سیمرغ اور لک لک کو تیتر بتایا ہو۔ ع

عنقا سیمرغ است و لک لک تیترا[1]

ظاہر ہو نہ عنقا سیمرغ ہو اور نہ لک لک تیتر۔ یہ غلطی نہیں تصرّف ہو۔ لیکن ایک اور مصرعے میں مصنّفِ خالق باری بھی تیتر کی فارسی درّاج بتاتا ہو ع

طاؤس مُور باشد و درّاج تیترا

(۲)

ثور ستور گاؤ ہے بلد

خواہی لادو خواہی ابلد

شیرانی صاحب کہتے ہیں یہاں "لادو" بمعنی "لدّو" یعنی باربردار ہو۔ لیکن امیر خسرو "دول رانی خضر خاں" میں باربردار کے لئے جو ہندی لفظ لائے ہیں وہ "لادی" ہو:۔ ے

سوم لادی گرفتہ بر سر اِیں بار

کہ در ہندیست لادی باربردار

---

[1] یہ متضاد معنی دینے والے مصرعے خالق باری میں تصرّف کی بین دلیل ہیں۔ ایک ہی مصنّف سے ایک ہی چھوٹی سی کتاب میں بیان کا اتنا اختلاف ناممکن ہو۔ پھر اسی صفحے میں آپ دیکھیں گے کہ خود مصنّف "تیترا" کو درّاج کہہ رہا ہو۔ ع

طاؤس مور باشد و درّاج تیترا

شیرانی صاحب کا خیال درست نہیں ہے۔ فی الحقیقت "خالق باری" کے شعر کے دوسرے مصرعے "خواہی لادو خواہی الد" کے معنی یہ ہیں کہ "چاہو لادو چاہو نہ لادو"۔ یہ غلط ہے کہ یہاں "لادو" لڈو کے معنی میں آیا ہے۔ لڈو کو ہندی میں लड्डू کہیں گے اور اس جگہ لفظ लादो آیا ہے۔ خسرو کے فارسی شعر میں "لادی" بالکل دوسرا لفظ ہے۔ جس کے معنی بوجھ اٹھانے والے مزدور کے ہوتے ہیں۔ "لادی"[1] کا اطلاق جانوروں پر نہیں ہوتا

(۳)

دیگ ہانڈی۔ کفچہ ڈوئی۔ بے خطا
تابہ و گزگاں کڑاہی و توا

شیرانی صاحب کہتے ہیں کہ لفظ گزگاں لغت میں نہیں ملتا۔ البتہ قازقاں، قزغاں اور گزگاں کے معنی فرہنگوں میں "تانبے کی بڑی دیگ" کے مندرج ہیں۔ شیرانی خالق باری کے "گزگاں" کو "قازقاں" وغیرہ مان کر کہتے ہیں کہ اس کا ترجمہ کڑھائی غلط ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مصنف خالق باری کے برعکس اس لفظ کے معنی خود امیر خسرو دیگ سمجھتے تھے۔ ثبوت میں خسرو کا یہ شعر درج کیا ؎

دلے با ایں ہمہ زیں خواں خالی شستہ بہ دستم
کہ حلوائے رضا پختہ نباشد اندریں کرغاں

---

[1] شیرانی صاحب فرماتے ہیں "لادی" فی زمانہ بوجھ کے واسطے آتا ہے یعنی اتنا وزن جو کوئی جانور ایک مرتبہ لے جا سکتا ہو"۔ معلوم ہوتا ہے شیرانی صاحب کا مطلب یہاں دھوبیوں کی اصطلاح لادی سے ہے لیکن اس کے یہ معنی بھی درست نہیں۔ دھوبی لادی میلے کپڑوں کی اس حالت کو کہتے ہیں جو بھٹی سے پہلے رہتی ہے۔ یہ درست ہے کہ اس حالت میں کپڑے ایک گٹھری کی صورت میں ہوتے ہیں جیسے ؎ نظر لطف ترے کپڑوں کی لادی لادنا جب یاد کرتے ہیں؛ تو اکثر شب کو دھوبی کے گدھے زیادہ کرتے ہیں لیکن امیر خسرو کے مصرعے میں لادی کا مطلب صرف باربردار مزدور ہے شیرانی صاحب کی "فی زمانہ" کی تخصیص سمجھ میں نہیں آتی۔

خسرو نے کڑ گاں کو گزغاں کہا ہے۔ لیکن یہاں بھی یہ لفظ کڑھاؤ کے معنی میں آیا ہے حلوا دیگ میں نہیں پکتا۔ کڑھاؤ میں پکتا ہے۔ ترکی میں قزغان کے معنی یقیناً دیگ ہیں لیکن ہندوستان آکر اس لفظ کی ہیئت بھی بدلی اور اس کے معنی بھی بدلے۔

بہرحال شیرانی صاحب امیر خسرو کو مصنف خالق باری سے الگ ہستی ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

شیرانی صاحب کے بنیادی دلائل رد ہو چکے۔ اب خالق باری کے لئے صرف ان کی کچھ قیاس آرائیاں باقی ہیں۔ جن پر روشنی ڈالی جائے گی۔

شیرانی صاحب کا ایک عجیب خیال شیرانی صاحب کا خیال ہے کہ اگر خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہوتی تو پچھلی صدیوں میں اس کی نہ جانے کتنی شرحیں لکھی جاتیں اور لغتوں میں اس کے حوالے ہوتے۔

خالق باری کا تصور کرنے سے پہلے شیرانی صاحب نے اس حقیقت پر نظر نہیں ڈالی کہ خسرو کے فارسی کلام اور ان کے ایجاد کئے ہوئے سیکڑوں صنائع و بدائع کی آجتک کوئی شرح نہیں لکھی گئی۔ خسرو کی بیش بہا تصانیف نثر کم یاب سے نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔ مگر اردو میں ان کا کوئی اقتباس بھی نہیں ہے۔ خسرو کی ہندی شاعری تو ایک طرف ان کی فارسی شاعری پر بھی ابھی تک کوئی فاضلانہ مضمون اردو میں نہیں لکھا گیا۔ بیچاری خالق باری تو ایک مکتبی کتاب ہے۔

خسرو کے زمانے میں ادبیات کی تدوین کا کام تو شروع ہو گیا تھا۔ لیکن تحقیق کا کام نکتۂ ابتدار کا انتظار کر رہا تھا۔ خالق باری اردو کتاب ہے۔ اردو میں تحقیق کی ابتدا خانِ آرزو متوفی ۱۱۶۹ھ سے ہوتی ہے۔ موصوف نے غرائب اللغات میں خالق باری سے

برابر اسناد پیش کیے ہیں۔

خان موصوف کے بعد سے ادبی تاریخ کا مطلع بالکل صاف ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ خالق باری آہستہ آہستہ مکتبوں سے نکل کر ادبی صحبتوں میں پہنچنے لگی تھی۔ اساتذہ نے اس سے سندیں لیں۔ اس کے شعر ضرب المثل بنے۔ مولوی نذیر احمد نے اس کے نسخے میں تبدیلیاں کیں وغیرہ وغیرہ۔

مقبولیت کے اعتبار سے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ خالق باری اردو کی مقبول ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ نہ معلوم شیرانی صاحب اس چھوٹی سی کتاب سے اور کیا توقع رکھتے تھے

فرہنگ مؤید الفضلاء اور خالق باری

شیرانی صاحب کا یہ خیال بھی بے بنیاد ہے کہ خالق باری فرہنگ مؤید الفضلاء سے متاثر ہے۔ خالق باری ۷۲۵ھ یعنی سنہ وفات امیر خسرو سے بہت پہلے تصنیف ہوئی اور فرہنگ مؤید الفضلاء ۹۲۵ھ میں لکھی گئی۔ ان دونوں کتابوں میں جہاں بھی یکسانیت ہے اس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ مؤید الفضلاء کے مصنف شیخ محمد لاڈ دہلوی نے امیر خسرو دہلوی سے استفادہ کیا۔ اس کے برعکس خیال خلافِ عقل ہے۔

شیرانی صاحب نے یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے کہ خالق باری بالخصوص مؤید الفضلاء سے اور بالعموم اس عہد کے دوسرے لغتوں سے اخذ کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو غلطیاں ان لغتوں میں ہیں وہی خالق باری میں بھی موجود ہیں۔ اپنے دعوے کی تائید میں وہ خالق باری کے حسبِ ذیل اشعار نقل کرتے ہیں:۔

(۱)

فارسی سیمرغ وعنقا ہست تدرو کبک ہنس

ہم چو یرقانست کافور ہو رنہ یہ و نسل بنس

شیرانی صاحب کا ارشاد ہے کہ فرہنگ مؤید الفضلاء میں تدرو کے غلط معنی کبک

بتائے گئے ہیں۔ اور خالق باری کے مندرجۂ بالا شعر میں بھی یہی غلطی موجود ہے۔
تدرو اور کبک کی بحث مختصراً اوپر ہو چکی ہے۔ صاحب مؤید الفضلاء نے تدرو کے معنی دُرّاج بتائے ہیں۔ لیکن ایک قدیم تر فرہنگ اداتُ الفضلاء کے حوالے سے اس کے معنی کبک بھی نقل کئے ہیں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اداتُ الفضلاء کے مصنف قاضی بدرالدین دہلوی کو بھی خالق باری کے مندرجۂ بالا شعر کے تصرف شدہ مصرع اول سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ اور وہ امیر خسرو کی سند کی بنا پر تدرو کے معنی کبک لکھ گئے۔ ۸۲۲ھ میں جب "اداتُ الفضلاء" تصنیف ہوا ہے تو خسرو کے انتقال کو صرف ۹۷ سال ہوئے تھے۔ ان کی شاعرانہ، عالمانہ اور قلندرانہ شخصیت کے اثرات بھرپور دہلی میں موجود تھے جن سے مصنف اداتُ الفضلاء بھی متاثر تھا۔ یہ عقیدت کی انتہا تھی کہ مصنف لغت نے خسرو کی مفروضہ سند کے بعد تصرف کے امکانات پر بھی غور کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور آنکھ بند کر کے غلط معنی لکھ دیئے۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں شعور لغت بھی بےحد محدود تھا۔ بہ مشکل دو ایک ناقص قسم کے لغت لکھے گئے تھے۔ غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عہد اداتُ الفضلاء تک تدرو کو کبک سمجھنے کی طفلانہ غلطی ہونے کا امکان خالق باری کے مذکورۂ بالا تصرفی مصرعے کے علاوہ کسی دوسری علمی تصنیف سے نہیں پیدا ہو سکتا۔ لغتوں کا سلسلہ خالق باری کے بعد ہی شروع ہوا اور اداتُ الفضلاء کی غلط فہمی کا ماخذ خالق باری معلوم ہوتا ہے۔

(۲)

نیا خالِ ہندی ماموں جاں
اور عمّو کہیئے چچا بجھاں

نیا کے معنی بعض ارباب لغت نے صرف نانا دادا لکھ کر چھوڑ دیئے ہیں۔ لیکن بیشتر مستند لغتوں نے اس لفظ کے معنی نانا اور دادا کے علاوہ ماموں اور بڑا بھائی بھی

لکھتے ہیں۔ یہ معنی مویدالفضلاء، برہان قاطع اور غیاث اللغات میں بحوالہ برہان رشیدی، لطائف، کشفِ مدار اور زفان موجود ہیں۔ شیرانی صاحب (اپنی کتاب حفظ اللسان کے صفحہ ۴۰ پر) سوائے نانا اور دادا کے تمام دوسرے معنی غیر معتبر بتاتے ہیں۔ ارباب لغت کے اتنے بڑے اجماع سے شیرانی صاحب کا بے دلیل اختلاف قابل غور ہے۔

شیرانی صاحب کا خیال ہے کہ خالق باری کے مندرجہ بالا شعر میں نیا کے معنی ماموں جان مویدالفضلاء سے ماخوذ ہیں۔ حالانکہ خالق باری میں نیا خال کہا گیا ہے۔ جس کے معنی کسی بھی صورت میں سوائے ماموں جان کے کچھ اور نہیں ہو سکتے۔ خالق باری کا مویدالفضلاء سے استفادہ کرنے کا خیال صرف خیال آرائی ہے۔

(۳)

شب چراغ یاقوت رتن ہے ہیرا ہے الماس
اور زمرّد ہے پنّا کہیے کسوت جان لباس

شیرانی صاحب فرماتے ہیں کہ شب چراغ گاؤ دریائی کا گوہر ہے۔ لہٰذا جواہر دریائی ہے۔ اور یاقوت جواہر کانی ہے۔ شب چراغ کو یاقوتِ رتن کا مرادف سمجھنا غلطی ہے۔ شب چراغ کے معنی معین کرنا بہت مشکل ہے۔ توہّم پرست ارباب لغت نے اسے کسی مفروضہ گاؤ دریائی کا مارچ لیمپ اور نہ جانے کیا کیا لکھا ہے جس پر اعتبار کرنا دشوار ہے۔ ادب میں گوہر شب چراغ اور لعلِ شب چراغ کا استعمال برابر ہوا ہے۔ مصنف خالق باری نے شاید لعل شب چراغ کی رعایت یاقوت کو شب چراغ کا مترادف قرار دیا ہے ؎

(۴)
ہندوی پلپل بود۔ فلفل دراز
مرچ فلفل گرد را گویند باز

شیرانی صاحب کے اندازے کے مطابق چونکہ پلپل کے یہی معنی مویدالفضلاء میں درج ہیں۔ لہٰذا خالق باری کے معنی مویدالفضلاء سے ماخوذ ہیں۔ حالانکہ حقیقت اسکے

برعکس ہونا چاہیئے۔ موخر سے مقدم اخذ نہیں ہو سکتا۔

(۵)

چراغ است دیا فتیل است باتی
بود جد دادا نبیرہ است نانی

نبیرہ کے معنی شیرانی صاحب فرزند زادہ قرار دیتے ہیں اور ساتھ ہی موید الفضلاء کے معنی بھی پیش کرتے ہیں جہاں تحریر ہے کہ "اس ملک میں نبیرہ لڑکی کے لڑکے کو کہتے ہیں۔" پھر ارشاد ہوتا ہے کہ خالق باری میں یہ غلط معنی موید الفضلاء سے آئے ہیں۔ حالانکہ اوپر کے اشعار میں بتایا جا چکا ہے کہ مقدم موخر سے ماخوذ نہیں ہو سکتا۔

جہاں تک نبیرہ کے معنی کا تعلق ہے ارباب لغت نے اس کے معنی نواسا اور پوتا دونوں لکھے ہیں جن میں نواسا عام طور پر رائج ہے۔

اردو میں اور خاص کر اہل لکھنؤ کے نزدیک نبیرہ کے معنی نواسا سمجھے جاتے ہیں جیسا کہ موید الفضلاء نے لکھا ہے کہ "اس ملک میں نبیرہ لڑکی کے لڑکے کو کہتے ہیں۔" آج بھی سند لغات کی بنا پر نبیرہ کو پوتا کہا جا سکتا ہے۔ لیکن مجھے یہ خلاف رواج زبان معلوم ہوگا۔ ہاں میں اس معنی کو غلط نہیں کہوں گا۔

مولوی ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے خالق باری پر اصلاحیں فرمائی ہیں اور اپنے "نصاب خسرو" میں نبیرہ کے معنی 'نانی' بدل کر پوتا لکھ دیئے ہیں۔ میری نظر میں موصوف کا یہ اقدام قابل غور ہے۔ واضح رہے کہ ڈپٹی صاحب خالق باری کو امیر خسرو کی تصنیف سمجھتے تھے اور اسے خسرو کا کلام مان کر اس پر اصلاحیں دی ہیں۔ کسی مستند نسخہ سے اگر کتاب کی تصحیح کی گئی ہوتی اور بات تھی۔

"پنجاب میں اردو" کے صفحہ ۱۳۹ پر شیرانی صاحب نے فرہنگ "موید الفضلاء" اور خالق باری میں درج ہندی الفاظ کو بالمقابل[۱]

[۱] موید الفضلاء مطبوعہ نول کشور پریس میں شیرانی صاحب کے پیش کردہ الفاظ سے اکثر جگہ اختلاف ہے معلوم ہوتا ہے شیرانی صاحب کے پاس موید الفضلاء کا کوئی اور نسخہ ہوگا۔

درج کیا ہے۔ اور دکھایا ہے کہ موید الفضلاء میں خالق باری کے ہندی لفظ سے قدیم تر ہندی لفظ موجود ہے۔ لہٰذا ان کے خیال میں موید الفضلاء، خالق باری سے مقدم ہے اور خالق باری اس فرہنگ سے ماخوذ ہے۔

موید الفضلاء ایک لغت ہے اور ہمیشہ اہل علم کی سپردگی میں رہا۔ اس میں تقلب اور تصرف ممکن نہ تھا۔ جو کچھ لکھا گیا تھا وہ آج بھی لکھا ہے۔ لیکن خالق باری مکتب کی کتاب ہے جب بھی زمانے اور مرزبوم کے تغیّر سے لفظوں کی صورت اور تلفّظ میں تبدیلی ہوئی تو مکتبی مولویوں نے ان متبدّل صورتوں کو اپنے مکتب کی خالق باری میں داخل کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ دو سو سال پرانی خالق باری کا متن پچاس برس پرانی خالق باری سے کافی مختلف ہوگا۔ یا۔ جو نسخے شمالی ہند میں لکھے گئے ہیں ان کا متن جنوبی ہند کے مخطوطوں سے اکثر الگ ہوگا۔

شیرانی صاحب نے موید الفضلاء اور خالق باری کے جن الفاظ کو بالمقابل پیش کیا ہے وہ سب بدلی ہوئی شکلوں میں بھی ہم وزن ہیں۔ ظاہر ہے نظم میں ہم وزن الفاظ بدلنے میں مولوی صاحب کو کیا دقت ہوئی ہوگی۔ جیسے

لفظ	حربا	
موید الفضلاء۔ ترجمہ۔	کھرکٹ	وزن فعلن
خالق باری ترجمہ	گرگٹ	

لفظ	بوئے	
ترجمہ	گند	وزن فاع
ترجمہ	باس	

لفظ	داس	
موید الفضلاء ترجمہ	ہنبوا	وزن فعلن
خالق باری ترجمہ	دانتی	

لفظ	خیارہ	
ترجمہ	ککھری	وزن فعلن
ترجمہ	ککڑی	

لفظ	جوزبوا	
موید الفضلاء ترجمہ	جاپھل	وزن فاعلن
خالق باری ترجمہ	جائے پھل	

لفظ	چارمغز	
ترجمہ	اکھروت	وزن مفعول
ترجمہ	اخروٹ	

لفظ	انگوزہ		لفظ	فازہ	
موید الفضلاء	ترجمہ ہیک	وزن	ترجمہ	جنوائی	وزن
خالق باری	ترجمہ ہنگ	فعل	ترجمہ	جمائی	فعولن

لفظ	ڈبّہ		لفظ	خرس	
موید الفضلاء	ترجمہ کوبہ	وزن	ترجمہ	بھال	وزن
خالق باری	ترجمہ کوپا	فعلن	ترجمہ	ریچھ	فاع

اس کے علاوہ دو تین لفظ اور ہیں :۔

دوغ کے معنی موید الفضلاء نے چھاچھ اور خالق باری نے مہی لکھے ہیں ۔ یہ دونوں لفظ مختلف الوزن ہیں ۔ لیکن خالق باری کا مہی قدیم تر لفظ معلوم ہوتا ہے۔

"آسمانہ" کے معنی موید الفضلاء نے (بہ قول شیرانی) چھتّہ لکھے ہیں اور سقف کے معنی خالق باری نے چھت بتائے ہیں ۔ لیکن موید الفضلاء نول کشور پریس میں اسمانہ کے معنی چھت مندرج ہیں ۔

"خنور" کے معنی موید الفضلاء کوٹھی بتاتا ہے اور "کندو" کے معنی خالق باری میں کوٹھیا ہے ۔ کوٹھی کا مفہوم آج سے ساڑھے چار سو سال پہلے موید الفضلاء کی تصنیف کے وقت کیا تھا یہ معلوم نہیں ۔ لیکن خنور کا ترجمہ ہے "ظرف" خصوصاً "ظرفِ مطبخ" کندو کے معنی کوٹھیا ہیں ۔ جو ایک مخصوص شکل کا ظرف گلی غلّہ رکھنے کے لئے بنایا جاتا ہے ۔ پرانی ہندی میں شاید کوٹھی اور کوٹھیا مختلف المعنی الفاظ ہوں ۔ ان دونوں لفظوں میں مقدم تر کا فیصلہ مشکل ہے ۔

آج کی زبان میں کوٹھی امراء کے بڑے مکان یا غلّے کے بڑے کھار کو کہتے ہیں ۔ کوٹھی کی تقلیل کوٹھا ۔ اور کھار کی تقلیل کھاری ہو سکتی ہے ۔

خالق باری کے اغلاط خالق باری تقریباً سات سو سال سے مکتب کے معلّموں اور طالبعلموں کے زیرِ مشق ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس چھوٹی سی کتاب میں بیسیوں ناقابلِ اصلاح غلطیاں

سرائت کر گئیں ہیں۔ لفظی اور معنوی صحت تو ایک طرف۔ بعض اشعار کو بہ اعتبار وزن موزوں پڑھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ مجھے بہ شمول نسخۂ شیرانی آج تک خالق باری کا کوئی صحیح نسخہ نہیں مل سکا۔

خالق باری کی جن غلطیوں کو شیرانی صاحب نے اچھالا ہے۔ ان کی تعداد میں اور اضافہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی میں اس کتاب کو امیر خسرو ہی کی تصنیف کہوں گا۔

میں ان مصیبتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا جو مکتبوں میں کتابوں پر نازل ہوتی ہیں علی الخصوص جب مختلف شعبہ ہائے زندگی کے مانوس اور نامانوس الفاظ کو دو سو شعر میں کھپانے کی کوشش کی گئی ہو اور وہ بھی اس عہد میں جب فرہنگ بالکل کالعدم تھے۔

ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ خالق باری کے علاوہ اور بہت سی کتابیں مکتبوں میں صدہا سال سے رائج ہیں۔ ان میں اتنی غلطیاں کیوں نہیں ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری مکتبی کتابیں فارسی یا عربی میں ہوتی تھیں اور غیر ملکی زبان کی حیثیت سے ایک مخصوص علمی معیار کے ساتھ ملک کے ہر حصے کے تعلیم یافتہ طبقے میں رائج تھیں۔ لیکن "خالق باری" ایک ایسی زبان کا لغت تھا جو اس وقت تک علمی اور معیاری سطح پر نہیں پہنچ سکی تھی۔ مرز بوم اور وقت کے ساتھ لفظوں کی صوری اور معنوی حیثیت بدل جاتی تھی۔ ظاہر ہے خالق باری دلّی اور پنجاب سے لیکر دکن تک اور عہد خسرو سے لیکر آج تک مکتبوں میں رائج رہی۔ اس مکان و زمان کے فصل سے زبان میں جو ناقابل فہم عبارتیں مکتب کے استاد مزاج نااہل استادوں کو نظر آئیں ان پر برابر ان کی اصلاحی قطع و برید ہوتی رہی۔

شیرانی صاحب کے غلط اعتراضات شیرانی صاحب نے خالق باری پر جو اعتراضات کئے ہیں۔ ان میں سے بعض درست بھی ہیں۔ لیکن خسرو کے کلام میں تحریف و تصحیف کے تصرفات کو میں پہلے ہی تسلیم کر چکا ہوں۔ جن کے بعد ان اعتراضات کا تعلق امیر خسرو سے نہیں رہتا۔

یہ کہنا قطعاً غلط ہو کہ خالق باری میں چونکہ اغلاط ہیں لہٰذا یہ امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ تحریف و تصحیف کے تصرفات، کسی تصنیف کا رشتہ اس کے مصنف سے نہیں توڑ سکتے کبیر۔ تلسی۔ سور۔ انیس۔ میر۔ فردوسی۔ رومی۔ سب ہی کے کلام میں تحریفات کا دخل ہو۔ کہیں کم اور کہیں بہت زیادہ۔ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ ان عظیم شعرا کی تصنیفات ان کی نہیں رہیں۔

کبیر کے یہاں تحریفات بحد انتہا ہیں۔ لیکن ان کا کلام آج بھی ہندی ادب کا بہترین تحفہ ہو۔ اب خیراتی صاحب کے اعتراضات پر ایک سرسری نظر ڈالی جاتی ہو جیسے :-

(۱)

دست برنجن کنگن کہیے پائل ہے خلخال

پائے برنجن چوڑا کہیے خوبی حسن و جمال

اعتراض ہو کہ چوڑیاں صرف ہاتھ کی ہوتی ہیں پاؤں کی نہیں ہوتیں۔ یہ درست نہیں۔ ہاتھ کی طرح پاؤں کی چوڑیاں بھی ہوتی ہیں۔

(۲)

کرم شب تاب است کیڑا چمکنا

نیز گویند آتشک اور ابران

اعتراض ہو کہ چمکنا بہ سکون میم غلط ہو۔ میم پر حرکت اور کاف ساکن ہونا چاہیے۔ میم متحرک اور کاف ساکن مصدر میں آئے گا۔ لیکن کرم شب تاب کے معنی دینے کے لیے میم کو ساکن اور کاف کو متحرک ہونا چاہیے۔ جس کے معنی ہوں گے چمکن والا یعنی جگنو۔ اس طرح کے اسم ہندی میں کم ہیں مگر ہیں جیسے :- دھونکنی۔ کترنی۔ چھٹنی۔ مرکھنا۔ کٹ کھنا جھجھنا۔ بیمنار وغیرہ

(۳)

گندم گیہوں ۔ نخود چنا ۔ شالی ہے دھان

جبرت جو نرتی ۔ عدس مسوری ۔ برگ ہے پان

جبرت کے غلط لفظ پر اعتراض ہو ۔ لغت میں لفظ یقیناً زرت یا زرّت آیا ہو ۔ یہ تصحیف کی غلطی ہو ۔ جس کا سبب ہند کی لہجہ ہو ۔ مصنّف پر اعتراض کیونکر ؟

(۴)

چرخہ رہٹہ غلّہ را پا گیلہ دال

رانڈ بیوہ زال را بوڑھی بخوان

پاگیلہ شیرانی صاحب کو لغت میں نہیں ملا ۔ خسرو کے زمانے کا ایک ہندی لفظ آج اگر مفقود ہو گیا ہو تو محلّ اعتراض کیوں پیدا ہو گا ؟

(۵)

شب گیر دلیل و شب تو بداں رات رین نس

قائند و تنہ ۔ شکر و گڑ ، جاں زہر بس

اعتراض ہو "شب گیر کو رات کہنا غلط ہو ۔ شب گیر وقت سحر بھی رات کا اسی طرح حصّہ ہو ۔ جیسے اشراق و عصر دن کا حصّہ ہیں ۔ اگر عصر کو دن کہا جا سکتا ہو تو ... شب گیر کو رات بھی کہا جائے گا ۔

(۶)

ہرن آہو جانیئے آہو بچہ کہیے غزال

بوزنہ بندر ترس رچھ آمدہ گیدڑ شغال

شیرانی صاحب کا اعتراض ہو کہ ہرن بسکون را غلط ہو ۔ گفتگو سات سو سال پرانی زبان پر ہو رہی ہو ۔ ہرن ایک ہندی لفظ ہو اور یہ فیصلہ کیونکر ہو کہ یہ عہد خسرو میں کس

طرح بولا جاتا تھا۔

(۷)

سمندر ہے آگ میں جیو کیڑا

چو بُعد است دورو چو نزدیک نیڑا

اعتراض ہے کہ بُعد کے معنی "دور" نہیں "دوری" ہیں۔ دور کے بعد "و" کمتنی ملاّؤں نے ٹھونس دیا ہے۔ مصرع یوں پڑھیے ۔۔مصرع

چو بعد است دوری چو نزدیک نیڑا

(۸)

سیر اگھانا کور کانا۔ بھید راز

گرسنہ بھوکا پیاسا تشنہ باز

"کور" کا ترجمہ "کانا" کرنے پر شیرانی صاحب کو اعتراض ہے۔ آج کی زبان میں شاید کوئی کور کا ترجمہ کانا نہیں کرے گا۔ لیکن عہدِ خسرو میں کانے کو بھی کور کہتے تھے۔ حکیم یوسفی ہروی (ہم عہد بابر) اپنے لغاتِ ہند کے قصیدے میں کور کا ترجمہ کانا ہی کرتے ہیں:۔

جیب دکن آمد زباں و گوش و دارھی ریش داں

(جیبھ) (کان) (داڑھی)

موچ رامی خواں بردت و کانا کور و بہرہ کر[۱]

بوچھ

---

[۱] شیرانی صاحب نے حفظ اللسان کے صفحہ ۸۰ پر حکیم یوسفی کے قصیدے کے کچھ اشعار نقل کئے ہیں اور یہ مصرع یوں لکھا ہے ع "موچ رامیخواں بردت دانہ کور دجر کرہ" ظاہر ہے کہ یہ مصرع غلط ہے۔ نہ دانہ اور کور میں کوئی رشتہ ہے۔ نہ بجر اور کر میں کوئی ربط ہے۔ ۔۔۔ نوٹ: یہ شعر پروفیسر مسعود حسن رضوی کے نسخے سے نقل کیا گیا ہے۔

(۹)

حربا گرگٹ کژدم بچھو راسو نیول
سگ ہے کتا ماہی مچھلی لقمہ کول

بہ سند مولانا امین چریاکوٹی شیرانی صاحب کو "کول" میں سکون واؤ پر اعتراض ہے یعنی ان کے خیال میں اس لفظ کو कवल کہنا چاہیئے۔ "کول" ایک تدبھو یعنی خودرد عوامی لفظ ہے۔ اس قسم کے لفظوں کی بہت سی شکلیں ضرورتِ شعر اور مرزبوم کے لہجوں کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ جیسے زیر غور لفظ میں कउरा - कवल - कवर - कौर - اور कौर برج اور اودھی میں رائج ہیں جن میں कवर اور कौर کا رواج سب سے زیادہ ہے۔ مسلمانی برج اور اودھی میں कौर نے कौल کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اور یہی شکل امیر خسرو کے مذکورہ بالا مصرعے میں ملتی ہے۔ برج اور اودھی میں مسلمان اور ہندو ہمسایوں کے لہجے میں بھی بہت سے لفظوں میں र اور ल کا فرق ملتا ہے۔[1]

(۱۰)

زر بود سونا، سیم جیتل، نقرہ روپا
جامہ کپڑا، ٹاٹ ٹپڑ، ڈبا کوپا

اعتراض ہے کہ سونا کا "نا" تقطیع سے گرتا ہے۔ خود شیرانی صاحب کی خالق باری میں یہ شعر اس طرح لکھا ہے ؎

زر بود سنا و سیم و نقرہ روپ
جامہ کپڑا ٹاٹ ہے ٹپڑ ڈب کوپ

یہ شعر خالق باری کی فصل پنجم کا ہے جس کا وزن ہے "فاعلاتن فاعلاتن فاعلات" معلوم نہیں شیرانی

---

[1] جیسے (الجھنا - ارجھنا) (سانولا - سانورا) - (باولا - باورا)
اس بحث کی توضیح کسی اور موقعہ پر مسلمان گھروں میں برج اور اودھی کے ضمن میں پیش کی جائے گی۔

صاحب نے "تا" تقطیع سے کس طرح گرا دیا۔

شیرانی صاحب کے سارے نکات کی مکمل تردید کر دینے کے بعد ایک سوال اب بھی باقی رہتا ہے یعنی خالق باری میں اغلاط کیوں ہیں؟" یہ سوال شیرانی صاحب کی تصنیف سے پہلے بھی تھا اور آج بھی باقی ہے۔ شیرانی صاحب کی طرح جی میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ امیر خسرو کی تصنیف میں یہ غلطیاں نہ ہوتیں۔ لیکن اس کے لئے میں سات سو سال کے مانے ہوئے حقائق کو رد کرنے پر تیار نہیں۔ ان غلطیوں کے اسباب جہاں تک میری سمجھ میں آئے میں نے کافی توضیح سے بیان کر دیئے ہیں۔

اختتامیہ اس بحث کو ختم کرتے ہوئے میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ شیرانی مرحوم ایک بالغ نظر محقق تھے۔ خالق باری کے معاملے میں مجھے ان کے نظریے سے اتفاق نہیں۔ لیکن شیرانی صاحب کی ژرف نگاہی سے انکار ناممکن ہے خالق باری پر ان کی کتاب ایک عالمانہ تھیسس ہے جس کا اہل علم ہمیشہ احترام کریں گے۔

مولانا امین حزیں یا کوٹی نے خالق باری کی فصاحت و بلاغت کے جو قصیدے پڑھے ہیں وہ مولانا کی محض خوش اعتقادی ہے۔ خالق باری کی خوبی صرف یہ ہے کہ وہ اپنے انداز کی پہلی کتاب ہے اسوقت ہندی فارسی کا کوئی لغت تصنیف نہیں ہوا تھا۔ ان حالات میں بجید مختصر سہی لیکن ایک منظوم لغت تصنیف کر کے خسرو نے فرہنگ نویسی کی رہنمائی کی ہے۔

نقش اوّل میں کمی رہ جانا یقینی بات ہے۔ اور خالق باری اس کلیئے سے آزاد نہیں، یہ بھی یقینی ہے کہ اس میں کافی شعر الحاقی ہیں جنھیں مکتب کے ملّاؤں نے جوڑ دیا ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ الحاق و تصرّف کے باوجود اس نظم کا ڈھانچہ اور اس کا بیشتر حصّہ اب بھی امیر خسرو کا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مصنّف کی ذات ان اغلاط سے بالاتر ہے جو اس کتاب میں نظر آتے ہیں۔ حالانکہ میرے اندازے کے مطابق یہ کتاب خسرو کی اوائل عمر کی تصنیف ہے۔

خسرو کے ہندی کلام کے متعلق تصنیفات

میرے خیال میں خسرو کی ہندی شاعری پر کوئی تحریر یا تصنیف معیاری اور عالمانہ سطح کی نہیں ہے۔ اس کا سبب کچھ تو اہل قلم حضرات کی اس طرف بے توجہی ہے اور کچھ وجہ یہ بھی ہے کہ اب خسرو کا ہندی کلام تبرک سے بھی کم باقی رہ گیا ہے۔ پھر اس تبرک ذخیرے میں بیشتر گیت اور چیستانیں ہیں جن پر تنقید و تبصرہ کرنے کی بہت کم گنجائش ہے۔ بہرحال میرے علم میں خسرو کی ہندی شاعری پر جو کچھ لکھا ہے اس کی ایک مختصر فہرست پیش کرتا ہوں۔

۱۔ پرانے تذکروں اور تاریخوں میں جہاں جہاں خسرو کی ہندی کا ذکر ہے انکے نام یہ ہیں:- سب رس۔ (وجہی دکنی)۔ منتخب التاریخ۔ (بدایونی)۔ تذکرہ عرفات (اوحدی)، نکات الشعرا (میر تقی میر)، مخزن نکات (قائم)، نقل مجلس (رجب علی)، اردوئے قدیم۔ (شمس اللہ قادری)، پنجاب میں اردو (محمود شیرانی) علی گڑھ۔ تاریخ ادب (مقدمہ ڈاکٹر مسعود حسن)۔

۲۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے ۱۸۵۲ء میں سب سے پہلے خسرو کا ہندی کلام "جنرل آف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال" میں شائع کیا۔

۳۔ آب حیات (آزاد) خسرو کے ہندی کلام کا ذکر ایک دلکش انداز میں پہلی مرتبہ آب حیات میں ہوا ہے۔ لیکن بات کہنے میں محققانہ احتیاط کی جابجا کمی نظر آتی ہے پھر بھی اگر آزاد کا قلم نہ ہوتا تو خسرو کی ہندی شاعری کے بعض گوشے شاید کبھی روشنی میں نہ آسکتے۔

۴۔ حیاتِ خسروی۔ (محمد سعید احمد مارہروی)۔ غالباً اس صدی کی ابتدا میں پہلا ایڈیشن نکلا۔ پھر دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۹ء میں نول کشور پریس نے شائع کیا۔ کتاب بہت ضخیم نہیں لیکن اس میں خسرو کی ہندی کے متعلق بڑی مفید اور دلچسپ معلومات ہیں۔

۵۔ حیاتِ خسرو۔ (مولوی شبلی)۔ پُر از معلومات کتاب ہے۔ خسرو کی ہندی شاعری پر بھی اجمالی گفتگو کی ہے لیکن بعض جگہ کتاب کا معیار شبلی کی سطح کا نہیں ہے۔

۶۔ سترھویں نامہ۔ (شہزادہ قدسی نظامی بھوپالی) یہ خسرو کے عرس سے متعلق ایک مختصر کتاب ہے جس میں چند صفحے ان کی ہندی شاعری کو بھی دیئے گئے ہیں۔ ادبیت سے زیادہ کتاب میں عقیدت ہے۔ ۱۳۵۲ھ میں میرٹھ سے شائع ہوئی۔

۷۔ جواہر خسروی۔ (رشید احمد سالم اور مولانا امین چریاکوٹی) خسرو پر آج تک جتنی کتابیں نکلی ہیں ان میں سب سے زیادہ اہتمام اور مصارف سے یہی کتاب شائع کی گئی ہے۔ لیکن اس میں ۲۰ فیصدی سے بھی کم خسرو ہیں۔ اور ۸۰ فیصدی سے زیادہ مولانا امین چریاکوٹی کی خارج از موضوع وغیر متوازن خامہ فرسائی ہے۔ ۱۹۱۸ء میں یہ کتاب علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ اس میں خسرو کی حسب ذیل مطبوعہ و غیر مطبوعہ منظوم رسالے شامل ہیں۔

۱۔ نصاب بدیعی (فارسی)

۲۔ نظم گھڑیال (فارسی)

۳۔ رباعیات پیشہ وراں (فارسی) غیر مطبوعہ

۴۔ خالق باری۔ (ہندی)

۵۔ چیستانیں۔ (ہندی)

۶۔ چیستانیں۔ (فارسی)

۷۔ ڈاکٹر وحید مرزا کا انگریزی مضمون "امیر خسرو کی ہندی شاعری" ۱۹۳۲ء میں ادارہ معارف اسلامیہ کے جلسہ لاہور کی روداد کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ مضمون میں کوئی خلص

گہرائی نہیں۔ لیکن خسرو کی ہندی شاعری سے متعلق منتشر معلومات کا ایک خاصا حصہ یکجا کر دیا گیا ہے۔

۸۔ امیر خسرو (ڈاکٹر وحید مرزا) یہ اردو میں خسرو پر سب سے جامع اور بڑی کتاب ہے۔ جسے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے ۱۹۴۹ء میں شائع کیا۔ اس میں خسرو کے ہندی کلام سے بھی بحث کی گئی ہے جس میں کم و بیش وہ سب نکات آگئے ہیں جو مصنف کے انگریزی مضمون میں تھے۔ یہ کتاب کئی اعتبار سے خسرو پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔

۹۔ امیر خسرو۔ (ادارہ تعلیم و ترقی مکتبہ جامعہ دہلی) یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جو بچوں کیلئے نکالا گیا ہے۔ جس میں امیر خسرو کا ہندی کلام بھی ہے۔

۱۰۔ امیر خسرو اور انکی ہندی شاعری (ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی) اگست ۱۹۶۱ء میں یہ کتاب لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ کتاب کا مضمون تو ۸۵ صفحے کا ہے لیکن خسرو کی ہندی پر صرف ۱۰ صفحے لکھے گئے ہیں۔ آخر کے ۸۶ صفحات میں خالق باری اور خسرو کا ہندی کلام چھاپا گیا ہے۔ جو بیحد مفید اقدام تھا۔ لیکن ناشر نے بے حد ظلم بے احتیاطی برتی ہے۔

۱۱۔ خسرو کی ہندی کویتا۔ (برج رتن داس) ناگری میں یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے جسے کاشی ناگری پرچارنی سبھا نے شائع کیا ہے۔ اس میں ایک ناقابل ذکر چھوٹے سے مقدمے کے ساتھ خسرو کا ہندی کلام بھی شائع کیا گیا ہے۔

۱۲۔ حیات امیر خسرو مصنفۂ نقی محمد خاں خورجوی (غالباً) ۱۹۶۴ء میں کتاب منزل لاہور (پاکستان) سے شائع ہوئی۔ مصنف نے ۸۰ سال کی عمر میں یہ کتاب لکھی ہے چند صفحوں میں خسرو کا ہندی کلام بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس تصنیف کا خاص مقصد خسرو کی موسیقی کے متعلق معلومات فراہم کرنا تھا اور یہی موضوع تقریباً نصف کتاب پر پھیلا ہوا ہے۔

صفدر آہ

کی

چند علمی اور ادبی تخلیقات

ہندوستانی ڈراما صفدر آہ ہمارے ملک کے ایک مستند عالم اور مانے ہوئے فنکار ہیں ان کی یہ فاضلانہ تصنیف نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کی پہلی اردو پیشکش ہے اور پبلیکیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات ہند کی معرفت فروخت ہو رہی ہے۔ اس کتاب کو یو، پی گورنمنٹ نے بھی انعام سے نوازا ہے۔

یہ کتاب ہندوستانی ڈرامے کا مکمل نصاب ہے جس میں ڈرامے کی تاریخ، اداکاری اور ڈرامے کے دیگر متعلقات پر بڑے دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

ہندوستانی ڈرامے پر ایسی پُرمغز کتاب دنیا کی کسی زبان میں نہیں نکلی۔

قیمت ۳/۷۵ روپیہ

فردوسیٔ ہند صفدر آہ کی یہ علمی تخلیق ممبئی یونیورسٹی کے ام۔ اے کے نصاب میں شامل ہو۔ نیز اس کتاب پر یو پی گورنمنٹ اور مہاراشٹر بک اوارڈ کمیٹی کے انعامات بھی مل چکے ہیں۔

یہ کتاب اردو مرثیے پر ایک ایسی بصیرت افروز تنقید ہو جس نے ناقدانہ فکر کے لئے نئی راہیں پیدا کر دی ہیں۔ فاضل مصنف نے نہایت عالمانہ انداز سے یہ ثابت کیا ہو کہ:۔

(۱) اردو مرثیہ رزمیہ (EPIC) ہو۔ نوحہ (ELEGY) قطعاً نہیں۔ (۲) صرف صنف مرثیہ اردو زاد ہو۔ اردو کے باقی تمام اصناف سخن فارسی سے ماخوذ ہیں۔ (۳) اردو مرثیہ ڈرامے کی ایک نئی شکل اور خوانندگی اداکاری کی ایک نئی صورت ہو۔ جسے اردو ثقافت کے فطری تقاضوں نے پیدا کیا۔

اس ضمن میں میر انیس کے شاگرد رشید اور خانوادہ انیس کے عظیم ترین رزم نگار مرثیہ گو فردوسیٔ ہند حضرت فارغ علیہ الرحمۃ کے ضخیم مراثی کا جائزہ لیا گیا ہو۔ فردوسیٔ ہند اردو تنقید کا ایک منفرد کارنامہ ہو۔ قیمت عام ایڈیشن ۔/۲ لائبریری ایڈیشن ۳/۸

علمدار کربلا فردوسیٔ ہند حضرت فارغ علیہ الرحمۃ شاگرد میر انیس کا عظیم رزمیہ شاہکار جو سارے ادب مرثیہ میں سب سے بڑا رزمیہ مرثیہ ہو حضرت عباس کے حال میں یہ مرثیہ رزم نگاری اور پرداز فکر کا ایک معجزہ ہو۔ صفدر آہ کے فکر انگیز مقدمے کیساتھ دوسرا اڈیشن شائع ہوا ہو۔ قیمت ۲/۲۵ روپیہ

زمزمہ صفدر آہ کی رباعیاں۔ شاعر کی جدت پسند طبیعت نے رباعی میں ایسے نئے فکری اور فنی تجربے کئے ہیں جو اس سے قبل اس صنف میں کبھی نہیں ہوئے۔ ان رباعیوں میں ایک عظیم فلسفی اور ایک عظیم شاعر بہ یک وقت ملاحظہ کیجئے۔

قیمت ۲/-

نو بہ نو فلسفۂ الہیات پر صفدر آہ کی یہ عظیم مثنوی صرف اردو ہی میں نہیں ادب عالم میں ایک گراں بہا اضافہ ہو۔

دنیا کی بڑی سے بڑی علمی زبان میں اس موضوع پر شاذ و نادر ہی ایسی نظمیں کہی گئی ہوں گی۔ شاعر نے الہیات کے نازک موضوع کو ایسے ترقی پسند زاویوں سے پیش کیا ہو کہ انسانی عظمت منتہائے عروج پر پہنچ جاتی ہو۔

قیمت رعایتی ۱/- روپیہ

گلبن صفدر آہ کی ترقی پسند نظموں کا حسین مجموعہ جس میں ایک صاحب طرز شاعر، بلند پرواز مفکر اور بالغ نظر محقق کا امتزاج اور قدیم و جدید ادب کا سنگم انتہائی دلکش انداز میں نظر آئے گا۔

صفدر آہ ترقی پسند تحریک کے سربراہوں میں ہیں۔ یہ حکیمانہ نظمیں ضرور ملاحظہ کیجئے۔

قیمت ۱/۵۰ روپیہ

صفدر آہ کی پرانی تصنیفات

(سنہ ۱۹۱۸ء سے سنہ ۱۹۳۶ء تک)

[یہ کتابیں اب کمیاب ہو گئی ہیں ان کی قیمتیں آرڈر آنے کے بعد لکھی جائیں گی]

فلسفۂ میر خدائے سخن میر تقی میر کی شاعری پر پہلی تنقیدی تصنیف۔ جس پر مصنف کو ایک ہزار روپیہ کا انعام ملا تھا۔

تکمیل ہجا اردو ہجا پر پہلی تصنیف جو بڑی حد تک اب بھی حرفِ آخر ہے۔

قومی زبان ہندوستان کی قومی زبان کے موضوع پر اردو میں پہلی تصنیف

تعلیم بالغین بالغین کی تعلیم کے لئے اردو میں پہلا قاعدہ

انجام محبت مصنف کی پہلی تصنیف (ناول)

گناہ کی دھار پرانے انداز کا ایک رنگین ناول

شرارے مصنف کے افسانوں کا مجموعہ

آہ کے سو شعر تیسرا ایڈیشن مصوّر

علوی بک ڈپو محمد علی روڈ بمبئی ۳

محمد افسر۔ پرنٹر و پبلشر نے یونیورسل پریس نو مدد تریجی اسٹریٹ بمبئی ۲ سے چھپوا کر علوی بک ڈپو محمد علی روڈ بمبئی ۳ سے شائع کیا